فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوار ربانی	ساتھیوں اور ماتحتوں سے حسن سلوک	عصمت اسامہ حامدی	7
قولِ نبیؐ	چھوٹے اعمال کا بڑا اجر	رفعت اشتیاق	11
گوشہِ سیرت	امہات المومنین	میر افسر امان	13
خاص مضمون	صحت مند طرزِ زندگی	فریدہ خالد	17
نوائے شوق	نعت	شاہدہ سحر	21
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	22
	غزل	شمیم فاطمہ	22
حقیقت و افسانہ	خانہ بدوشوں کا ڈیرا	بنت الاسلام	23
	بھنور کی آنکھ	قانتہ رابعہ	25
	ارمان	ربیعہ ندرت	27
	چراغ	عالیہ حمید	35
	دلِ نادان	طوبیٰ احسن	42
سلسلہ وار کہانی	کہیں چاند راہوں میں کھو گیا	نصرت یوسف	46
سفرِ سعادت	طوافِ زیارہ	قانتہ رابعہ	53
سیر و سیاحت	اک ذرا لندن تک	آمنہ راحت	56
نمایاں خواتین	زلیخا	آسیہ راشد	60
ہلکا پھلکا	ڈرائی پورٹ	سعدیٰ مقصود	65
گوشہِ تسنیم	یہ روز و شب	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	69
خفتگانِ خاک	آہ یہ جدائی!	عالیہ شمیم	71
گھر داری	بدلتے موسم	آسیہ راشد	74
مطالعہ گاہ	تبصرہ کتب	صائمہ اسما	76
کچن کارنر	مزیدار کھانے	زیب اسد	76
محشر خیال	شمیم فاطمہ، عبدالمجید		77
منتخب کالم	میکیاولی کی سیاست	محمد اسماعیل ریحان	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز وشب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

ہم پاکستانیوں کی تسبیح روز وشب بھی کچھ ایسے ہی شمار ہوتی ہے۔ ایک ماہ کیا گزرتا ہے کہ حوادث کی ایک فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔ اللہ کرے ہمارے حالات تبدیل ہوں، آنے والے الیکشن کے نتیجے میں مخلص لوگ برسر اقتدار آئیں اور ملک کو امریکی غلامی سے نجات دلائیں، اپنے مسائل کو اپنے تناظر میں حل کریں اور ہر شہر میں حالات خراب کرنے والے سی آئی اے، را اور موساد کے ایجنٹوں سے ملک کو پاک کریں چاہے وہ کسی بھی نام سے سرگرم ہوں۔

سانحہ عباس ٹاؤن میں ۴۸ لوگ جان سے گزر گئے۔ واقعے کو شیعہ سنی فساد کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی مگر عوامی رائے میں کھل کر یہ بات سامنے آئی کہ یہاں شیعہ سنی فسادات کا نہ کوئی ریکارڈ موجود ہے اور نہ ہی کوئی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں دونوں فرقے باہم مل جل کر رہتے تھے اور دونوں ہی حادثے کا شکار ہوئے۔ رحمان ملک نے پنجابی طالبان کا مبہم اور بے سروپا بہانہ تراشا مگر ان من گھڑت باتوں کا زمینی حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح لاہور میں جوزف کالونی کے واقع سے متعلق نہایت عجیب وغریب حقائق پیش کیے گئے۔ پولیس کے بیان کے مطابق دس ہزار حملہ آور تھے جنھوں نے گھروں کو جلایا۔ آناً فاناً اتنے لوگ کیسے اکٹھے ہو گئے جبکہ اس سے پہلے وہاں کبھی مذہبی منافرت کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور جبکہ پولیس مجرم کو گرفتار بھی کر چکی تھی۔ سپریم کورٹ نے واقع کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے پنجاب حکومت کے بیانات کو مسترد کر دیا ہے اور اہم سوالات اٹھائے ہیں مثلاً یہ کہ پولیس لوگوں کو خطرے کے پیش نظر گھر خالی کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اگر خطرے کی اتنی مصدقہ اطلاعات تھیں تو اس کی روک تھام کے لیے کوئی ایکشن کیوں نہ لیا گیا؟

کوئٹہ، کراچی اور خیبر پختونخواہ کے کئی علاقے حسب سابق دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ کی زد میں رہے۔ کراچی میں گولیوں کا نشانہ بننے والوں میں عباسی شہید ہسپتال کے نوجوان ڈاکٹر اور ایک معروف عالم دین بھی

شامل ہیں۔حکومت غنڈوں کو پکڑنے کے بجائے ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔سب قاتلوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر زبان کھولتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

انہی حالات میں حکومت کے آخری دن آن پہنچے۔صوابدیدی فنڈز اور اختیارات کا اندھا دھند استعمال دیکھنے میں آیا۔آخری دنوں میں تقرریاں اور تبادلے عروج پر رہے۔جہاں ملکی خزانے سے آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی ایسی ذہنیت اور روایت پائی جاتی ہو وہاں نگران حکومتوں کے چند ہفتے قوم پر کتنے بھاری ہوں گے،اس کا خیال ہی روح فرسا ہے۔اللہ کرے انتخابات بروقت اور بخیر و عافیت ہو جائیں اور شفاف ہوں تا کہ آئندہ آنے والی حکومت کے بارے میں عوام اپنی قسمت کا خود فیصلہ کر سکیں۔

عدالت عالیہ کی جانب سے بجلی کے بلوں کے نادہندگان کے کاغذاتِ نامزدگی روک لینے کا حکم بھی خوش آئند ہے۔کاش کہ اس شرط کا دائرہ بڑھا کر این آر او زدہ اور کرپشن میں ملوث سیاستدانوں کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جائے۔

بنگلہ دیش میں ۱۹۷۱ء میں جن لوگوں نے پاکستان کی سالمیت کی خاطر جانوں کے نذرانے پیش کیے اور پاکستانی فوج کے شانہ بشانہ لڑ کر ایک تاریخ رقم کی، وہ گزشتہ ۴۲ سال سے قوم پرستوں کے ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں اور آج اتنے برسوں کے بعد جبکہ دو نسلیں بڑی ہو چکی ہیں اور وہاں کے عوام نے بھی ان واقعات کو فراموش کر دیا ہے،ایسے لوگوں کو موت اور عمر قید کی سزائیں سنائی گئی ہیں۔ان سزاؤں کے خلاف خود بنگلہ دیشی عوام میں سخت صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے۔انسانی حقوق کی تنظیموں اور کئی مسلم و غیر مسلم حکومتوں نے بنگلہ دیش کی حکومت کو اس ظلم سے باز رہنے کے لیے دباؤ ڈالا ہے۔ایسے میں پاکستانی حکومت کی جانب سے سخت بیان نہ آنا انتہائی بے حسی کا مظہر ہے۔جن مخلص لوگوں نے اُس کڑے وقت میں پاکستان کے وجود کی خاطر سب کچھ داؤ پر لگا دیا،آج ان کی سزا کو پاکستان بھی ''بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ'' کہہ کر آنکھیں چرا لے، یہ انتہائی تکلیف دہ اور شرمناک بات ہے۔پاکستانی حکومت،فوج اور عوام تینوں کی جانب سے ان سزاؤں پر مشترکہ ردعمل سامنے آنا چاہیے تا کہ بنگلہ دیش کی بھارت نواز حکومت اس ظلم سے باز رہے۔

ایک خبر کے مطابق پنجاب حکومت نے فروری میں دسویں جماعت کی اردو لازمی کے نئے ایڈیشن میں سے اسلامی اور نظریاتی تحریریں نکال دی ہیں۔مثلاً پاکستان کا اسلامی نظریہ (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان) اور حضرت عمرؓ ایک عظیم منتظم (علامہ شبلی نعمانی) علامہ اقبال کی تمام نظمیں بشمول طلوعِ اسلام،صدیقؓ اور شانِ تقویٰ نیز مولانا الطاف حسین حالی اور ماہر القادری کا کلام۔دیگر نکالے گئے مضامین میں فاطمہ بنت عبداللہ (مرزا ادیب) مسدس حالی (مولوی

(علامہ راشد الخیری) شامل ہیں جو سب کے سب اسلامی اصولوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اسلامی تصوف پر درد اور غالب کی غزلیں بھی نکال کر ان کی جگہ بھارتی ہندو شاعر فراق گورکھپوری کو متعارف کروایا گیا جو بھارتی اور روسی حکومتوں سے ایوارڈ یافتہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے ایجنٹ کہیں ہمارے اندر بیٹھے یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور ہم ان کے آگے بے بس ہیں۔ اس سے قبل یہ رپورٹ بھی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے کہ پنجاب حکومت نے ایک برطانوی اور ایک امریکی ماہر تعلیم کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جن کے مشورے پر نظام تعلیم میں تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں پہلی جماعت سے مخلوط تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم بھی شامل ہیں۔ پنجاب حکومت کے یہ اقدامات تشویش ناک ہیں اور نہ صرف ہماری نئی نسل کو ہماری علمی وراثت اور تہذیب سے کاٹنے کا باعث ہیں، بلکہ شرح تعلیم کو مزید کم کرنے کی وجہ بھی بنیں گے۔

طالبہ دعا

صائمہ اسما

ساتھیوں اور ماتحتوں سے حُسن سلوک

انسان کی فطرت ہے کہ وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، وہ ایک گھرانے اور خاندان کا حصہ ہوتا ہے، پھر اسے زندگی کے مختلف شعبہ جات میں اپنے ہی جیسے، دوسرے انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے اور یوں مل جل کر معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ ایک فرد کا تعلق، دوسرے افراد کے ساتھ جہاں ''مادی نوعیت'' رکھتا ہے، وہیں ''اخلاقی'' بھی ہے۔ انسانوں کے رویے، موڈ اور برتاؤ کے اثرات، دوسروں پر لازماً پڑتے ہیں اور پھر کچھ نتائج دکھاتے ہیں۔

جس دور میں اس وقت انسانیت سانس لے رہی ہے، وہ مادہ پرستی (materialism) اور مشینوں کا دور ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی واخلاقی قدریں، مدھم پڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ افراد سے لے کر اقوام تک میں پیسہ کمانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے، یقیناً نفسانفسی کا عالم ہے۔ رہی سہی کسر، مروجہ نظام تعلیم نے پوری کردی ہے۔ برصغیر میں جو نظام تعلیم، لارڈ میکالے نے ''کالے انگریز'' بنانے کے لیے تشکیل دیا تھا، جس کی رُو سے بندے بندوں پر حکومت کریں، انسان اپنے جیسے انسانوں پر حکم چلانا اپنا حق تصور کرے، اسی طرح خادم، مالک کے آگے صرف سر جھکانا جانتے ہوں، اس کے اثرات مختلف تعلیمی سکیموں اور مکاتبِ فکر (Schools of thought) کے ذریعے عصر حاضر میں بھی جاری ہیں۔ اس سرمایہ دارانہ نظام، مادہ پرستی، نفسانیت اور نظام تعلیم کی خرابی نے معاشرے کو بے چینی، انتشار اور ظلم کی کیفیات سے دوچار کیا ہے۔ اکثر محکموں اور اداروں میں کام کرنے والے افراد (workers) کی کوئی تکریم نہیں کی جاتی بلکہ معمولی بات پر تذلیل کردی جاتی ہے۔ بعض سکولوں میں اساتذہ کو چھٹی والے دن بھی کام پر بلایا جاتا ہے، اور اس کی کوئی اضافی تنخواہ نہیں دی جاتی، چنانچہ لوگ انتظامیہ سے نالاں ہوجاتے ہیں یا پھر اس ادارے سے ہی۔ مزید برآں بہت سے ایسے بھی ساتھی ہیں جو اپنے ساتھی کام کرنے والوں کے (colleagues) کے متعصّبانہ وحاسدانہ سلوک پر اذیت کا شکار ہیں۔ ایسے ماحول میں کام کرنا بھی دشوار ہوجاتا ہے جہاں ہر کوئی دوسرے کو دھکا دے کر

خود آگے بڑھنا چاہتاہو، یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔اس صورت حال کا حل، صرف اور صرف دین رحمت یعنی اسلام میں ہی ہے۔ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر ایک آقا و پروردگار کی غلامی میں دے دینا، ہر مسئلے کا علاج ہے۔ جو اقوام اور معاشرے دین کی آغوش میں پناہ لے رہے ہیں وہاں اطمینانِ قلب کا عالَم ہی کچھ اور ہے۔ اسلام میں نہ صرف ساتھیوں، ہمسایہ، ماتحت اور غلام کے حقوق موجود ہیں بلکہ حضورﷺ کا عملی نمونہ، تمام حقوق کی ادائیگی کا لائحہ عمل فراہم کرتا ہے۔

بندگی صرف اللہ کی:

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ترجمہ: ''اور تم اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرو اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور رشتے دار ہمسائے سے اور اجنبی ہمسائے سے اور پہلو کے ساتھی سے اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں (احسان کا معاملہ رکھو) یقین جانو، اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔'' (النساء 36)

رسولؐ اللہ نے اہلِ نجران کو (جو مذہباً عیسائی تھے) ایک خط لکھا جس کا ایک حصہ یہ ہے:

''اَمّا بعد، میں تم لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی غلامی اور پرستش سے نکل کر اللہ کی بندگی اور پرستش اختیار کرو۔ نیز میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی آقائیت اور سرپرستی سے نکل کر اللہ کی آقائیت اور اقتدار میں آجاؤ۔''

(تفسیر ابنِ کثیر، جلد 1)

رسولؐ اللہ، اپنے رُفقاء میں:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک اونٹ پر تین آدمی سوار ہوتے تھے (یعنی باری لیتے تھے کیونکہ سواریوں کی قلت تھی) تو ابولبابہؓ اور علیؓ بن ابی طالب، رسولؐ اللہ کے ساتھ تھے، جب نبی کریمؐ کی باری پیدل چلنے کی آتی تو دونوں کہتے کہ آپؐ سوار ہو کر چلیں، ہم پیدل چلیں گے۔

نبی کریمؐ فرماتے کہ ''تم دونوں مجھ سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو۔ اور تم دونوں سے زیادہ پیدل چلنے کے اجر کا طالب میں ہوں۔''

(اور اس طرح باری میں مساوات رکھتے) (مشکوٰۃ)

حضرت براابن عازبؓ کہتے ہیں، بخدا جب لڑائی ہوتی تو آپؐ ہم سب کے آگے ہوتے اور ہم آپؐ کے ذریعے اپنا بچاؤ کرتے (یعنی حضورؐ، ساتھیوں کے لیے ڈھال بن جاتے) اور ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا جو نبی کریمؐ کے ساتھ ہوتا۔'' (بخاری)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا:

''مجھے دین کی دعوت دینے کے سلسلے میں جتنا خوف زدہ کیا گیا، اتنا کسی اور کو نہیں کیا گیا اور خدا کے دین کی دعوت کی راہ میں مجھے اتنی اذیتیں دی گئیں جو کسی دوسرے کو نہیں دی گئیں۔ تیس دن اور تیس راتیں، ایسی گزری ہیں کہ میرے پاس اور میرے رفیقِ سفر بلالؓ کے پاس کوئی بھی کھانے کی چیز نہ تھی، سوائے اس تھوڑی سی چیز کے (یعنی کھجوریں) جس کو بلالؓ اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھے۔'' (اس طرح حضورؐ نے اپنی مشکلات میں اپنے ساتھی کی رفاقت کا ذکرِ خیر کیا) (ترمذی)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

''جو شخص لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔'' (ترمذی)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں:

''رسولؐ اللہ سفر میں قافلے کے پیچھے رہتے، کمزوروں کو چلاتے اور انہیں اپنی سواری پر پیچھے بٹھا لیتے اور ان کے لیے دعا فرماتے۔'' (جیسے ایک گلہ بان اپنے ریوڑ کی نگرانی کرتا ہے) (ابوداؤد)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک بدو (دیہاتی) جن کا نام زاہر بن حرامؓ ہے، ان کا معمول یہ تھا کہ دیہات کی چیزیں حضورؐ کے لیے بطور ہدیہ لاتے اور حضورؐ بھی شہر کی کچھ چیزیں بطور ہدیہ ان کے ساتھ کر دیتے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا: ''زاہر ہمارے دیہاتی دوست ہیں اور ہم ان کے شہری دوست ہیں۔'' نبیؐ ان سے محبت فرماتے تھے زاہر بدصورت آدمی تھے۔ ایک دن جبکہ وہ مدینہ میں اپنا دیہاتی سامان بیچ رہے تھے، حضورؐ پیچھے سے آئے اور انہیں اپنی گود میں لے لیا کہ زاہرؓ آپؐ کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے کہا ''کون ہے؟ مجھے چھوڑ۔''

جب مڑ کر دیکھا تو نبیؐ تھے، تب وہ پوری کوشش کرنے لگے کہ اپنی پیٹھ کو پیارے نبیؐ کے سینے سے چمٹائے رکھیں۔ اس موقع پر نبیؐ نے فرمایا: ''اس غلام کو کون خریدتا ہے؟'' زاہرؓ نے کہا: ''یارسولؐ اللہ! آپؐ

گھاٹے میں رہیں گے۔(مجھے بیچ کر بہت تھوڑی قیمت پائیں گے)'' نبیؐ نے فرمایا:''تم دنیا کے لوگوں کی نظر میں کم قیمت ہوتو کیا ہوا۔اللہ کے ہاں تمہاری بڑی قیمت ہے۔''(مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اللہ سبحانہٗ سے یہ دعا مانگی:

''یااللہ اسلام کو عمرؓ بن خطاب یا ابوجہل بن ہشام کے ذریعے قوت عطا فرما۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعا حضرت عمرؓ کے حق میں قبول فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی بنیادوں کے مضبوط ہونے کا اور بت پرستی کی عمارت کے گر جانے کا ذریعہ بنایا۔''(طبرانی)

بہت ہی اہم بات، اس حدیث نبویؐ میں بیان فرمائی:

''میں تمہاری طرح انسان ہوں،تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے مدِ مقابل کی نسبت زبان پر زیادہ قدرت رکھتا ہو، پس اگر ایسی صورت ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں حالانکہ حقیقت میں وہ اس کے بھائی کا حق ہو تو وہ اس میں سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ لے کیونکہ یہ تو اس کے لیے آگ کا ٹکڑا ہے۔''(صحیح بخاری،صحیح مسلم)

آخرت کی جواب دہی:

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ جب کسی بندے کو کچھ لوگوں پر اقتدار بخشتا ہے تو چاہے وہ تھوڑے ہوں یا زیادہ ہوں، اس بندے سے اللہ قیامت کے دن اس کے ماتحت لوگوں کے بارے میں محاسبہ ضرور کرے گا کہ جو لوگ اس کے ماتحت تھے ان پر اللہ کا دین جاری کیا یا اس کو برباد کیا۔ یہاں تک کہ آدمی کے اپنے مخصوص اہلِ خاندان کے بارے میں بھی سوال کرے گا۔''

(مسند احمد)

اختیار کا استعمال:

حضرت ابوبکر صدیقؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا:

''وہ شخص جنت میں نہ جائے گا جو اپنے اقتدار و اختیار کو غلط طریقے سے استعمال کرتا ہو۔''

لوگوں نے کہا:''یارسولؐ اللہ! کیا آپؐ نے ہمیں نہیں بتایا تھا کہ دوسری امتوں کے مقابلے میں اس امت میں یتیم اور غلام زیادہ ہوں گے۔''

آپؐ نے فرمایا: ''ہاں، میں نے تمہیں یہ بات بتائی ہے تو تم لوگ ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو جیسا اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہو، ان کو وہ کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔''

لوگوں نے پوچھا:

''ہم کو دنیا کی کون سی چیز (آخرت میں) نفع پہنچائے گی؟''

آپؐ نے فرمایا: ''وہ گھوڑا جسے تم تھان پر باندھ کر کھلاؤ تا کہ اس پر سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرو، تمہارا غلام، تمہاری جگہ کام کرتا ہے، اس سے اچھا سلوک کرو، اور اگر وہ نماز پڑھتا ہو (مسلمان ہو) تو وہ تمہارے اچھے برتاؤ کا زیادہ مستحق ہے۔''

(ترغیب وترہیب بحوالہ مسند احمد، ابن ماجہ وترمذی)

امیر (سربراہ) کے فرائض:

حضرت ابن عباسؓ، نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار ہو تو اللہ اس کا مقصد پورا نہیں کرے گا جب تک وہ لوگوں کی ضروریات پوری نہ کرے۔'' (ترغیب وترہیب بحوالہ ترمذی وطبرانی)

(لوگوں کی اجتماعی ضروریات کی فکر اسی وقت کرے گا جب وہ مامورین کے لیے شفیق ہوگا، اس کے دل میں ان کی محبت ہوگی)

ماتحتوں پر ظلم وبدسلوکی:

حضورؐ نے فرمایا: ''حاکم جب تک ظلم نہ کرلے، اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ ظلم کا ارتکاب شروع کرتا ہے تو اللہ اسے اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔'' (ابن ماجہ) حضرت ابوبکر صدیقؓ، نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''بخیل، دھوکہ باز آدمی، بے ایمان، خیانت کار آدمی جو غلط طریقے سے اپنے اختیار وتصرف کو استعمال کرتا ہے یہ جنت میں نہیں جائیں گے اور غلاموں میں سے سب سے پہلے جنت میں جانے والا وہ غلام ہوگا جس نے اللہ کے حقوق بھی ٹھیک سے ادا کئے ہوں گے اور اپنے آقا کی خدمت بھی عمدگی کے ساتھ کی ہوگی۔''

(ترغیب وترہیب بحوالہ مسند احمد وابویعلی)

حضرت فضالہ بن عبیدؓ کہتے ہیں، رسولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا:

''تین قسم کے انسان مصیبت اور آفت ہیں:

۱۔وہ حاکم اورامیر جس کی اچھی طرح اطاعت کی جائے لیکن وہ اس کی قدر نہ جانے اور کوئی غلطی کر بیٹھو تو معاف نہ کرے۔

۲۔وہ برا پڑوسی، اگر تم اس کے ساتھ بھلائی کرو تو اس کا نام تک نہ لے، کہیں بیان نہ کرے۔اور اگر برائی دیکھے تو ہر جگہ پھیلاتا پھرے۔

۳۔وہ بیوی جو تمہیں ایذا دے جب تم گھر میں آؤ، تمہاری غیر موجودگی میں خیانت کرے۔'' (ترغیب وترہیب بحوالہ طبرانی)

مشہور فرمان ہے: لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰہ ..... یعنی اللہ کی نافرمانی میں (سربراہ کی) اطاعت نہیں۔(مسلم)

رسولؐ اللہ نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو فرمایا:

''مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔'' (بخاری)

ایک شخص نے حضورؐ سے دریافت کیا:

''میں اپنے خادم کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں؟''

آپؐ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے اس نے پھر عرض کیا ''رسولؐ اللہ میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟''

آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ہر روز ستر دفعہ''

(جامع ترمذی، معارف الحدیث)

''جس نے کسی سے معذرت کی (جو جائز تھی) اور اس نے قبول نہ کی تو وہ (عُذر قبول نہ کرنے والا) حوضِ کوثر پر نہ آسکے گا۔(طبرانی)

حدیث نبویؐ ہے: ''مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت دے دو۔'' (ابنِ ماجہ)

اور فرمایا: ''مسلمانوں کی ناحق ہتک کرنا (تذلیل و استہزاء) گناہِ کبیر ہے۔''

(مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

''غلام کو خوراک ولباس دیا جائے اور اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے۔''

(مسلم)

رسولؐ اللہ کا خوفِ خدا:

رسولؐ اللہ نے فرمایا: ''اے اللہ! میں نے تجھ سے ایک وعدہ لے لیا ہے (قبولیت دعا کا وعدہ) جس کی تو

ہرگز خلاف ورزی نہ کرے گا۔ میں انسان ہوں تو جس کسی مسلمان کو میں نے تکلیف دہ بات کہی ہو برا بھلا کہا ہو، اس پر لعنت کی ہو، اسے کوڑے مار دیئے ہوں تو میرے فعل کو اس مظلوم کے لیے قیامت کے دن سبب رحمت ومغفرت اور ذریعہ قربت بنادے۔''

(متفق علیہ، راوی حضرت ابو ہریرہؓ)

حرفِ آخر:

انسانی معاملات اور تعلقات کو درست رکھنا، بہت اہم ہے اس لیے باہمی روابط کو مضبوط بنیادوں پر استوار رکھنے کے لیے محاسبہ نفس کی بہت اہمیت ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''تین چیزوں سے آپؐ نے ہمیشہ اپنی ذات کو محفوظ رکھا۔

۱۔ کبر وغرور سے۔

۲۔ مال ودولت جمع کرنے سے۔

۳۔ فضول اور لایعنی باتوں سے۔

اسی طرح تین چیزوں سے آپؐ نے دوسروں کو محفوظ رکھا،

۱۔ کبھی کسی کی مذمت نہ کی، نہ کسی کی تحقیر کی۔

۲۔ کسی کو عیب لگا کر شرمندہ نہیں کیا۔

۳۔ کبھی کسی کے پوشیدہ عیوب کی کرید نہیں کی۔ آپؐ صرف وہی بات کرتے جس پر خدا سے اجر وثواب کی توقع ہوتی۔

(داعی اعظم، محمد یوسف اصلاحی)

اَللّٰھم اَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنَنَا وَاَلِّفْ بَیْنَ قُلُوبِنَا، وَاھْدِنَا سُبُلَ السَّلَام وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّور ۔

''اے اللہ! ہمارے (مسلمانوں کے) تعلقات درست رکھ اور ہمارے دلوں کو جوڑے رکھ، ہمیں سلامتی کے راستوں پر چلا اور ہمیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آ (آمین)

☆☆☆

چھوٹے اعمال کا بڑا اجر

انسان جہاں دنیاوی معاملات میں شارٹ کٹ کی جستجو میں رہتا ہے، دین کے معاملے میں بھی وہ چاہتا ہے کہ کچھ مختصر مگر پر اثر ایسا نسخہ کیمیا ہاتھ لگ جائے جو اس کا وقت کم لے مگر اجر میں زیادہ ہو۔ صحابہ کرامؓ جہاں دن رات عبادات میں منہمک و مگن رہتے وہیں وہ ایسے مختصر اعمال کی بھی تلاش میں ہوتے جو ان کی آخرت کی نیا پار لگا دیں۔

جامع ترمذی میں عبداللہ بن بسر سے مروی ہے کہ ایک شخص خدمتِ رسولؐ میں حاضر ہو کر یوں ملتمس ہوا: اے اللہ کے رسولؐ! دین کے احکامات تو میرے لیے بہت زیادہ ہو گئے ہیں مجھے کوئی ایسی جامع چیز بتا دیجیے کہ جس پر میں مضبوطی سے کاربند رہوں۔ آپؐ نے فرمایا، تیری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابوذرؓ کی روایت ہے کہ نادار صحابہؓ نے ایک روز رسولؐ کی خدمت میں عرض کی کہ اے اللہ کے رسولؐ! مالدار تو سارا اجر و ثواب سمیٹ کے لے گئے، ہمارے لیے تو کچھ بچا ہی نہیں کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں تو ہمارے برابر وہ بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی وہ ہمارے ساتھ ہی رکھتے ہیں مگر جب وہ صدقہ کرتے ہیں تو ہم نہیں کر سکتے، کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا، اللہ نے اس کے قائم مقام تمہارے لیے بھی مواقع مہیا فرمائے ہیں۔ اللہ کی تسبیح کرنا بھی صدقہ ہے، ہر تکبیر بھی صدقہ ہے، اس کی حمد بھی صدقہ ہے، لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کہنا بھی صدقہ ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابوذرؓ ہی سے مروی ہے کہ اللہ کے نبیؐ نے فرمایا: جب بھی کوئی مسلمان صبح کرتا ہے تو اس کے ہر جوڑ پر صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے اور پھر فرمایا، ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تحمید صدقہ ہے، اور آخر میں فرمایا: اگر چاشت یعنی سورج نکلنے کے بعد دو رکعتیں پڑھ لی جائیں تو یہ تمام جوڑوں کے صدقہ سے آدمی کے لیے کافی ہو جاتی ہیں۔

کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال بھی ہیں کہ جن کے بدلے بندے کو وہ اجر ثواب اور درجات ملتے ہیں

کہ جو بندے کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آ سکتے، یعنی کہ اتنے سے عمل کا اتنا بڑا اجر بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً صحیح مسلم میں ہے رسولؐ نے فرمایا: میں نے ایک شخص کو جنت میں اٹھکیلیاں کرتے دیکھا جو محض اس عمل کے بدلے میں جنت کا حقدار ہوگیا تھا کہ اس نے راستے سے رکاوٹ بننے والی ایک شاخ ہٹا دی تھی۔ ایک کے بارے میں یہ یوں مذکور ہے کہ اس نے راستے سے راہیوں کے لیے تکلیف کا باعث بنتا درخت کاٹ کے ہٹا دیا تھا۔

صحیح مسلم میں سیدنا انسؓ سے مروی ہے کہ اللہ کو اپنے بندے کی یہ ادا بہت بھاتی ہے کہ وہ جب بھی کسی مشروب کا گھونٹ بھرے یا کوئی لقمہ لے تو ہر گھونٹ اور ہر لقمے پر رب کی حمد بیان کرتا جائے۔

وضو ایک چھوٹا سا عمل ہے اور شاید دو منٹ بھی اس پر صرف نہیں ہوتے مگر اجر اس کا ایسا ہے کہ بندہ عش عش کر اٹھے۔ ابو ہریرہؓ سے روایت صحیح مسلم میں مذکور ہے، فرمایا جب بندہ چہرہ دھوتا ہے تو چہرے کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں، جب ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ کے اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ یا فرمایا وضو کے آخری قطرے کے ساتھ سارے گناہ دھل جاتے ہیں اور بالآخر جب یہ وضو کر کے اٹھتا ہے تو گناہوں سے صاف شفاف ہو کر اٹھتا ہے۔

امام مسلمؒ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ اللہ کے نبیؐ نے دریافت کیا، کیا تمہیں وہ عمل نہ بتادوں کہ جس سے تمہارے گناہ مٹیں اور درجات بلند ہوں، جنت کی چاہ کے حریص صحابہؓ کو اور کیا چاہیے تھا، عرض کی ضرور بتایئے اے اللہ کے رسولؐ، فرمایا: سردی اور گرمی کے ناگوار لمحوں میں پوری طرح وضو کرنا، بکثرت مسجدوں کی طرف چل کر جانا اور نماز کے بعد اگلی نماز کے انتظار میں رہنا، یہ رباط یعنی سرحدوں پر پہرا دینے کی طرح ہے۔

ابوداؤد میں عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے رسولؐ نے فرمایا جو اِستِغفَار کو لازم کرلے، اللہ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ اور ہر غم کا ازالہ پیدا فرما دیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق فراہم کرتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو۔

اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ نماز پڑھی، وقت کی کمی کی وجہ سے یا مصروفیت کے باعث دعا پر ہی اکتفا کیا۔ لیکن ایک کھٹکا ضرور رہتا تھا کہ اگر ہم بیمار ہو جائیں تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، ڈاکٹر نسخہ لکھ کر دیتا ہے جس

پرہم من وعن عمل کرتے ہیں۔ نسخے کے مطابق صبح ودوپہر شام دوائی کھاتے ہیں۔ اس پر کامل یقین ہوتاہے۔لیکن اگر یہی یقین اس نسخے پر بھی ہو جو آج سے چودہ سوسال پہلے ہم سب کے روحانی ڈاکٹر حضرت محمدؐ نے اپنی بیٹی کو دیاتھا، یعنی تسبیحاتِ فاطمہ کا پڑھنا۔ سُبْحَانَ اللّٰہ، اَلْحَمْدُللّٰہ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ تو ہم بہت سے فوائد سمیٹ سکتے ہیں۔یہ وقت میں برکت کا آزمودہ نسخہ ہے۔یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیں۔ ساری تھکاوٹ منٹوں میں غائب ہوجاتی ہے۔لیکن یقین کامل شرط ہے۔

سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم حدیث کے کلمات ہیں جوادا کرنے میں بہت ہلکے مگراجر کے لحاظ سے بہت وزنی ہیں اور اللہ رحمان ورحیم کو بہت محبوب ہیں۔ بخاری میں شداد بن اوس سے مروی ، رسولؐ کی چند جملوں پر مشتمل ایک دعا، جسے سیدالاستغفار کہتے ہیں، مذکور ہے۔اس کے فضائل میں درج ہے کہ جس نے یقین کے ساتھ اسے دن میں پڑھا اور اسی دن وہ شام سے پہلے فوت ہوگیا تو وہ اہل جنت میں سے ہے اور جس نے کامل یقین کے ساتھ اسے شام کو پڑھا اوروہ دن سے پہلے پہلے اسی شام فوت ہوگیا تو وہ بھی اہل جنت میں سے ہے۔(یہ دعاادارہ بتول کی طرف سے شائع کردہ منزل میں موجود ہے)امید ہے ہم عمل کے اعتبار سے ان معمولی مگر اجر کے اعتبار سے غیر معمولی اعمال کواپنا روزمرہ کا معمول بنا کر اجروثواب کے ہمالیاؤں کا مالک بننا ضرور پسند کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

☆☆☆

فریدہ خالد

صحت مند طرزِ زندگی

قرآن وسنت کی روشنی میں چند اہم اصول جو ہمیں موٹاپے سے بچا سکتے ہیں

پاکستان بھر میں موٹاپے کے شکار افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ کے مطابق وطن عزیز میں ۲۶ فیصد عورتیں اور ۱۹ فیصد مرد موٹاپے کا شکار ہیں اور بچوں میں یہ شرح ۱۰ فیصد کے حساب سے بڑھ رہی ہے (THE NEWS,"Obesity on the increase in Pakistan", Jan09,2013)

طبی تحقیق کے مطابق موٹاپا ایک بہت ہی پیچیدہ بیماری ہے جو مزید کئی بیماریوں کا سبب بنتی ہے جن میں دل کی بیماریاں، جوڑوں کا درد، مختلف اقسام کے کینسر اور ذیابیطس قابل ذکر ہیں۔ ذیابیطس کو تو ''ام الامراض'' کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ موٹاپے سے دنیا بھر میں شرح اموات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق موٹاپا دنیا بھر میں ہونے والی اموات کی پانچویں بڑی وجہ ہے۔

موٹاپے کی کئی وجوہات ہیں، جن میں غیر متوازن غذا کا استعمال، بسیار خوری، کاہلی وسستی سے بھرپور لائف اسٹائل اور روزمرہ زندگی کے مسائل پر صحت مندانہ انداز میں قابو پانے کی صلاحیت میں کمی شامل ہیں۔ غذا کے سلسلے میں آج کل مختلف اقسام کے ڈائٹ پلان موجود ہیں جو اکثر غیر متوازن غذا پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ اس پلان پر عمل کر کے لوگ اپنا وزن کم کر سکتے ہیں۔ کئی لوگوں کو واقعی ان پر عمل کر کے وقتی فائدہ بھی پہنچتا ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جیسے ہی انہوں نے اس ڈائٹ پلان پر عمل درآمد چھوڑا وزن دوبارہ بڑھ گیا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ ان پلانز پر تمام عمر عمل کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اسی لیے کہ یہ چند ماہ تک کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

البتہ کچھ ماہرین ایسے بھی ہیں جو اپنے ڈائٹ پلان متوازن غذا کو سامنے رکھ کر بناتے ہیں اور اس کے ساتھ متحرک طرز زندگی اور اسٹریس کو قابو کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ برصغیر کے مشہور ماہر غذائیت ایم کے گپتا اپنی کتاب "Foods: they are killing aer hilling you slowely but steadily میں صحت مند زندگی گزارنے کے تین سنہری اصول بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

۱۔چینی، مصالحے، چکنائیاں، نمک اور تمباکو نوشی کو کم سے کم رکھیں۔

۲۔باقاعدگی سے ورزش کریں۔

۳۔ذہنی دباؤ اور تناؤ سے دور رہیں۔

دراصل یہی طریقہ کار مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ انسان کے پورے طرز زندگی کو بدل دیتا ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کی تعلیمات میں صحت مند زندگی گزارنے، بیماریوں سے محفوظ رہنے اوران کے علاج کے اہم نکات موجود ہیں۔لہٰذا اس میں موٹاپے جیسے گھمبیر مسئلے کا حل بھی ضرور ملے گا۔قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں نوع انسانی کے ہر مسئلے کا حل ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔''اور ہم نے آپ پر وہ عظیم کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے۔''(النحل:۹۷)اس کے علاوہ آپ ﷺ کا فرمان ہے۔''اللہ نے کوئی ایسی بیماری نہیں اتاری جس کی شفاء نازل نہ کی ہو۔''(بخاری،۲:۷۴۷)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وسنت میں وہ کونسے طریقے ہیں کہ جن پر عمل کر کے ہم وزن کی زیادتی یا موٹاپے میں مبتلا نہ ہوں اور اگر ہم اس کا شکار ہو چکے ہیں تو کیسے اپنے وزن کو کم کریں؟ یہ اس لیے ہے کہ ہم ان طریقوں پر عمل کر کے قوی مومن بن سکیں اور دنیا وآخرت کی کامیابی حاصل کر سکیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ''طاقتور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر اور محبوب ہے''(ابن ماجہ)

قرآن وسنت کی روشنی میں تین سنہرے اصول درج ذیل ہیں انہیں اپنائیں اور تمام عمر کے لیے صحت مند زندگی اور وزن کے مالک بن جائیں۔

۱۔متوازن غذا پر مشتمل اپنا منفرد وڈائٹ پلان تشکیل دیں:

ڈاکٹر طاہر القادری اپنی کتاب''قرآن اور جدید سائنس'' میں رقم طراز ہیں کہ اچھی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان ایسی خوراک کا انتخاب کرے جو متوازن ہو اور تمام جسمانی ضروریات کو بہتر طور پر پورا کر سکے اور یہ کہ حلال غذائیں جن کی ترغیب قرآن وسنت سے ملتی ہے وہی دراصل انسانی جسم کے لیے حیرت انگیز حد تک مفید ہیں(صفحہ۵۹۴)۔قرآن میں ہمیں مختلف اقسام کے گوشت، سبزیوں اور پھلوں کا ذکر ملتا ہے۔ حیات طیبہ کا مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آپؐ نے چھوٹے اور بڑے گوشت کے استعمال کیا ہے لیکن آپؐ

نے سفید گوشت (یعنی مچھلی اور پرندوں وغیرہ کو گوشت) کو ترجیح دی۔ پرندوں کے گوشت کو تو قرآن میں ''جنت کی خوراک'' کہا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے ''اور انہیں پرندوں کا گوشت ملے گا، جتنا وہ چاہیں گے'' (الواقعہ۔۲۱)۔ اس کے علاوہ مختلف اقسام کی سبزیوں اور پھلوں کا ذکر بھی قرآن میں ملتا ہے۔ جیسے کہ کھیرا، ساگ، مسور، انجیر، زیتون، انار، انگور اور کھجور وغیرہ۔ جنت کی نہروں میں پانی، شراب، دودھ اور شہد کا ذکر ہے۔ شہد کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔'' (النحل:۶۹)۔ مطالعہ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ صبح نہار منہ نیم گرم پانی میں شہد ملا کر پیتے تھے اور یہ کہ آپؐ نے اناج میں جو کو پسند فرمایا کبھی تلبینہ (جو کا دلیہ دودھ اور شہد کے ساتھ) کی شکل میں تو کبھی روٹی کی صورت اور کبھی ستو پیئے۔ آج وزن گھٹانے کے لئے نہار منہ گرم پانی میں شہد پینے اور جو کے استعمال سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

اس کے علاوہ آپؐ نے تمام عمر کبھی چھلنی کا استعمال نہ کیا اور میدہ تو چکھا بھی نہیں۔ آج ہم دن رات میدے کے بنی اشیا مثلاً مختلف اقسام کی مٹھائیاں، کیک، بسکٹ، پراٹھے، نوڈلز اور پزا وغیرہ کھا رہے ہیں اور چھلنی کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں تو پھر ہم کیسے صحت مند رہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مغیث انجم دل کے عوارض کی شرح میں اضافے کے بارے میں کینیڈا کی شیوت فاؤنڈیشن برائے میڈیکل ریسرچ ۱۹۴۷ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''دل کے امراض میں مسلسل اضافے کا اصل سبب چھنا ہوا اور مل کے ذریعہ پسا ہوا گندم کا آٹا ہے۔'' (دل کی بیماریوں اور ان کا علاج، صفحہ ۲۰)۔ آپؐ کے حلیہ مبارک کے بارے میں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، بتانے والے بتاتے تھے کہ آپؐ کا وزن بڑھا ہوا نہ تھا اور یہ کہ آپؐ کا پیٹ کمر سے لگا ہوا تھا۔ آج اگر ہم اپنے اردگرد کا جائزہ لیں تو ایسے کتنے لوگ نظر آئیں گے جو چالیس سال کے بعد بھی چپکے ہوئے پیٹ کے مالک ہیں۔ بلکہ آج ہم اپنے بڑھتے ہوئے پیٹ ہی سے سب سے زیادہ پریشان رہتے ہیں اور کیوں نہ ہوں، آخر جب وزن بڑھنا شروع ہوتا ہے تو پیٹ سے ہوتا ہے۔ سوچیئے اگر ہم بھی اپنے نبیؐ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے میدے کا اتنا زیادہ استعمال زندگیوں سے نکال دیں، بھوک رکھ کر کھانا کھائیں اور صرف اس وقت ہی کھائیں جب بھوک لگی ہو تو ہمارے وزن کو اعتدال میں رکھنے یا بڑھے ہوئے وزن کو گھٹانے سے کیا چیز روک سکتی ہے اور سنتوں پر عمل کرنے کا اجر بھی ملتا رہے گا۔

اپنا ڈائٹ پلان تشکیل دیتے وقت ان نکات کا

خیال رکھیں:

الف) حلال اور طیب خوراک کا استعمال:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مواقع پر انسان کو حلال اور طیب کھانا کھانے کی ترغیب دی ہے۔ سورہ النحل میں فرمایا ہے۔ ''پس اے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور طیب رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو'' (۱۶:۱۱۴)۔ سورہ المائدہ میں فرمایا: ''جو کچھ حلال وطیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ اور پیو'' (۲:۱۶۸) ان تمام آیات میں حفظان صحت کے ایک بڑے اہم اصول کی بات کی گئی ہے کہ حلال اور پاک کھانا کھاؤ۔ حلال اور حرام کی تفریق تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی بتادی ہے لہٰذا وہ تمام کھانے جو اللہ نے حلال قرار دیے ہیں وہی ہمیں کھانے ہیں اور جن حرام چیزوں سے اس نے روکا ہے ان سے رک جانا ہے۔ کھانے میں دوسری بات ہے کہ کھانا پاک ہو۔ پاک کھانے سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مولانا مودودی اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ

''جو چیزیں اصولِ شرع میں سے کسی قاعدے کے ماتحت ناپاک قرار پائیں یا جن چیزوں سے ذوقِ سلیم کراہیت کرے یا جنہیں مہذب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساس نظافت کے خلاف پایا ہو، ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے'' (صفحہ ۲۸۵)

ب) بسیار خوری سے بچا جائے:

قرآن مجید میں ہر طرح کے اسراف کو ناپسند فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، ''کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو بیشک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا'' (الاعراف:۳۱) آپؐ نے فرمایا ''اپنی ڈکار کم کرو، اس لیے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ بھوکا وہ ہوگا جو دنیا میں زیادہ پیٹ بھرتا ہے۔'' (ترمذی) یہ صحت مند رہنے کا بہت اہم اصول ہے لہٰذا جب بھوک لگے صرف اسی وقت کھانا کھانا چاہیے اور ابھی کچھ بھوک باقی ہو تو ہاتھ روک لے۔ جیسا کہ آپؐ نے فرمایا ''ایک حصہ کھانا، ایک حصہ پانی اور ایک حصہ سانس کے لئے خالی رکھو'' (ترمذی) یہ اصول وزن گھٹانے میں اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس حدیث سے متعلق ڈاکٹر خالد غزنوی اپنی کتاب ''علاج نبویؐ اور جدید سائنس'' میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو ہم سب کے لیے سوچنے اور عمل کرنے کے قابل ہے، کہ میڈیکل کالج میں علم طب کے ایک استاد کرنل محمد ضیاءاللہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے پاس ذیابیطس کے ایک

مریض زیرعلاج تھے۔ مریض نے کرنل صاحب سے مشورہ کیا اور لندن کے ایک پروفیسر ایلین کے پاس گیا جو کہ اس بیماری کے علاج کے لئے عالمی شہرت رکھتے تھے۔ پروفیسر ایلین نے مریض سے معلوم کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ مریض نے بتایا کہ وہ مسلمان ہے اور پاکستان سے آیا ہے۔ پروفیسر نے یقین نہ کیا تو مریض نے کہا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر پروفیسر نے جواب دیا کہ اگر تم مسلمان ہو تو تم کو ذیابیطس نہیں ہوسکتا اس لیے کہ تمہارے نبیؐ نے کم کھانے کی تاکید کی ہے۔ جس نے بھی اس پر عمل کیا اسے یہ بیماری نہیں ہوسکتی اور اگر تم نے اپنے نبیؐ کی بات پر عمل نہ کیا، بسیار خوری کی تو پھر اپنے مذہب کو بدنام نہ کرو۔ (صفحہ ۳۵۰) اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ وزن کی زیادتی کی وجہ سے دل پر اضافی بوجھ پڑتا ہے لہٰذا دل کے امراض سے بچنے کے لئے موٹاپے سے بچنا ضروری ہے۔

ج) پانی کا استعمال کریں:

اکثر اوقات ہم دن بھر میں چند گلاس سے زیادہ پانی نہیں پیتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم پانی کی کمی کا شکار ہوجاتے ہیں یا پھر ہم اپنی پیاس کو بھی کھانے سے بھگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا جب بھوک کا احساس ہو تو پہلے پانی پی کر دیکھیں کہ فرق پڑتا ہے یا نہیں اگر پانی پینے سے آپ کی بھوک کا احساس ختم ہوجائے تو سمجھ لیں کہ آپ کو پیاس لگی تھی نہ کہ بھوک۔ دن بھر میں آٹھ گلاس پانی ضرور پییں اور گرمی کے موسم میں حسبِ ضرورت مقدار بڑھا دیں۔

ان تمام باتوں کا ذہن میں رکھتے ہوئے اپنا منفرد ڈائٹ پلان تشکیل دیں جو آپ کی عمر، بجٹ اور پسند کے مطابق ہو تا کہ آپ اس پر باقی تمام عمر عمل پیرا ہوسکیں۔

۲: متحرک انداز زندگی اپنائیں:

آج کے ترقی یافتہ دور میں ذرائع نقل و حمل کی سہولتوں اور گھریلو کام کاج کو نمٹانے کے لئے مشینی آلات کی فراوانی نے نہ صرف ہم کو جسمانی مشقت سے بچالیا ہے بلکہ ہمیں بے حد سست اور کاہل بھی بنا دیا ہے۔ اور اس سستی اور کاہلی کا پھل ہمیں جسمانی چربی اور موٹاپے کی صورت ملا۔ لہٰذا متوازن غذا کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی زندگیوں کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں اکثر جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو چلنے پھرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا "وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو، اس کی چھاتی پر اور کھاؤ اس (اللہ) کا رزق، اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے۔" (سورہ

الملک:۱۵) چنانچہ اپنے روزمرہ کے کاموں کو خود کرنے کی عادت ڈالیں مثلاً اگر پانی کی طلب ہو تو بجائے دوسرے کو کہنے کے خود اٹھ کر پئیں۔ یقین جانیں آپ کے یہ چند قدم بھی آپ کی صحت بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے اس کے علاوہ گھر کی صفائی، ستھرائی اور دیگر کام خود کریں، لفٹ کے بجائے سیڑھیاں استعمال کریں، بچوں کے ساتھ کھیلیں، قریبی جگہوں پر جانے کے لئے گاڑی کے بجائے پیدل چلنے کو ترجیح دیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی قسم کی ورزش کا آغاز کریں۔ مرد حضرات جو سارا دن کرسی پر بیٹھے دفتری کام میں مصروف رہتے ہیں، ان کو صبح سویرے یا شام کو جسمانی ورزش کو اپنا معمول بنانا چاہیے۔ اس کے لئے:۔

الف) اپنا منفرد ایکٹیوٹی پلان (Unique activity plan) بنائیے۔

جس طرح ہر انسان کی ذمہ داریاں، ضروریات اور مصروفیات مختلف ہوتی ہیں اسی طرح ہر کسی کی جسمانی صحت، دلچسپیاں اور facilities بھی الگ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا منفرد منصوبہ ترتیب دینا چاہیے جو ہمارے طرزِ زندگی میں فٹ ہو سکے اور پھر وہ ہماری باقی تمام زندگی کا حصہ بن جائے۔ اس پلان میں کچھ وقت لازماً کسی نہ کسی ورزش کے لیے مختص کریں۔ ورزش کا انتخاب اپنی عمر، پسند اور ماحول کے مطابق کریں۔ چہل قدمی کرنا، سیڑھیاں چڑھنا، رسی کودنا، سائیکل چلانا، بچوں کے ساتھ کھیلنا پھر کسی جم میں ایروبک کلاسز وغیرہ لینا سب اچھی ترجیحات ہو سکتی ہیں۔ آپ چاہیں تو مختلف ورزشوں کو بدل بدل کر بھی کر سکتے ہیں تاکہ آپ کی دلچسپی برقرار رہے۔ ڈاکٹر مغیث انجم دل کے امراض سے بچنے کے لئے ورزش اور جلد کی مالش کا باقاعدگی سے انتظام کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

(ب) چہل قدمی کرنا:

چہل قدمی کرنا سب سے بہترین اور محفوظ ورزش ہے۔ اپنی عمر، ماحول اور ضرورت کے مطابق جگہ کا انتخاب کریں اور کم از کم ہفتے میں ۴ سے ۵ دن ۲۰ منٹ سے ۴۰ منٹ تک چہل قدمی کریں۔ یاد رہے کہ شروع میں کم وقت سے آغاز کریں اور رفتہ رفتہ وقت اور دنوں کو بڑھاتے جائیں۔ یوں تو صبح کا وقت چہل قدمی کے لئے سب سے مناسب ہے جب ماحول میں خاموشی اور آکسیجن کی کثرت ہوتی ہے لیکن اگر یہ آپ کے لئے مناسب نہیں تو پھر آپ کیلئے شام یا رات کا وقت بہتر رہے گا خاص کر رات کا کھانا اگر جلدی کھا لیا جائے اور اس کے بعد ۱۵ سے ۲۰ منٹ کی واک کی جائے تو اس کے

بڑے فائدے ہیں۔عربی کا ایک مقولہ ہے کہ ''دوپہر کا کھانا کھاؤ تو لیٹ جاؤ، رات کا کھانا کھاؤ تو چہل قدمی کرو۔''

مطالعہ حیات طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پیدل بہت زیادہ چلتے تھے اور اپنے کام خود کیا کرتے تھے اسی لیے آپ کو کبھی واک کرنے یا ورزش کے لیے علیحدہ وقت مختص کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔

(۳)اپنے اسٹریس کو بہتر طور پر مینیج کرنا سیکھیں:

مطالعہ کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان stress کی حالت میں ایسے کام کرتا ہے جو اس کی صحت کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ پریشانی میں کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں جبکہ دوسرے بے تحاشہ کھانے لگتے ہیں اور زیادہ تر وہ جنک فوڈ ہی کھاتے ہیں جو جلد اور آسانی سے میسر آجاتی ہے۔کچھ لوگوں کی روزمرہ کی روٹین خراب ہوجاتی ہے۔وہ ایسے وقت میں اپنی ورزش، چہل قدمی او ردوسری صحتمندانہ روٹین کو چھوڑ دیتے ہیں یا ڈیپریشن کی صورت میں تو خاص کر آپ جس قدر خود کو جسمانی اور ذہنی طور پر مصروف رکھیں گے اسی قدر جلد اس کو بھگانے میں کامیاب ہونگے۔اس سلسلے میں قرآن وحدیث سے ہمیں بہترین رہنمائی ملتی ہے چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے۔

۱۔قرآن مومنین کے لیے شفاء ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''اور ہم نے قرآن نازل کیا ہے جو تمام مومنوں کیلئے شفا اور رحمت ہے''بقول ڈاکٹر خالد غزنوی ''یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا عام طور پر ایک لمبی صحت مند زندگی گزارتا ہے کیونکہ قرآن مجید نے ہر اس چیز کی تاکید کی ہے۔جو مفید ہے۔قرآن ہمیں بہترین غذا کا نمونہ بتاتا ہے، بیماری وتندرستی کا محافظ ہے اور اس امر کی گارنٹی دیتا ہے کہ اگر ہم اللہ کے دوست بن جائیں تو وہ ہمیں رنج وغم اور دہشت سے محفوظ رکھے گا۔(طب نبوی اور جدید سائنس،جلد دوئم:صفحہ۳۰)

ب۔صبر،نماز اور روزے سے مدد طلب کرنا:

سورہ البقرہ میں ارشاد ہے کہ ''واستعینو بالصبر والصلواۃ(اور صبر اور نماز سے مدد لو)اپنی دل پسند خوراک اور آرام طلبی کو چھوڑ کر صحت مندانہ طرز زندگی گزارنا شروع میں نفس پر بھاری ہوگا ایسے میں صبر کرنا بے حد ضروری ہے۔اس کے ساتھ ہی نماز ادا کرنا کہ یہ ذکر الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔نماز میں بندہ

اپنے رب سے بے حد قریب ہوجاتا ہے خاص کر سجدے کی حالت میں جیسا کہ فرمان الٰہی ہے :وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب (سورۃ العلق)یعنی سجدہ کرواور قریب ہوجاؤ۔اس کے علاوہ روزہ بھی نفس پر قابو پانے اور وزن گھٹانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ روزہ معدے کو بیکار اجزا سے صاف کرتا ہے اور اس طرح موٹاپے میں کمی کا سبب بنتا ہے۔

(ج)باقاعدگی سے قرآن مجید کی تلاوت اور اس پر غور و فکر کریں،صدقہ وزکوٰۃ دیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کریں او راسے یاد کریں کیونکہ اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں(الرعد:۲۸) اعلیٰ اخلاقی اقدار مثلاً خیر خواہی، احسان و ہمدردی،نرمی وانکساری اور غم خواری کی آبیاری کریں۔اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے خوب خوب دعائیں مانگیں کیونکہ دعائیں مومن کا ہتھیار ہیں۔

ان تمام طریقوں پر پورے یقین اور مستقل مزاجی سے عمل کرتے ہوئے ایک صحتمند اور خوشحال زندگی کی طرف اپنا سفر شروع کردیں۔

☆☆☆

نعت رسولؐ مقبول

ہے زندگی کا مدعا
عشقِ رسولؐ مصطفٰے
یہ جان بھی قربان ہے
کیا چیز ہے دنیا بھلا
مادر، پدر، اولاد بھی
قربان بہ نامِ مرتضےٰؐ المطفیٰؐ المصطفیٰؐ
عشقِ رسولؐ مصطفیٰ

بدر و حنین و اُحد ہیں
سب آپ کے قدموں تلے
شام و سحر، گُل، خوشبوئیں
سب آپؐ ہی کے واسطے
ارفع خدا نے خود کیا
نامِ رسولؐ مجتبیٰ

کامل ہے اُسوہ آپ کا
کامل ہدایت آپ کی
چاہیں جو رب سے مغفرت
لازم اطاعت آپ کی
جو صرف پیغمبرؐ نہیں
بلکہ حبیبؐ کبریا

ہم آپ کے ہیں اُمتی
یہ ناز اپنا ہے بجا
جادہ فلاح و امن کا
ہے آپ ہی کا طے شدہ
اِن ظلمتوں میں نور ہے
بس آپ کی صدق و صفا

ہر مرتد و ملعون کی
گستاخیوں کو ہے فنا
ہے وعدہِ حق الوکیل
دشمن ہے ابتر آپ کا
دائم پکارا جائے گا
بعد از خدا، صَلِّ علیٰ

ختم الرسل ہیں آپ ہی
سردار ہیں نبیوں کے بھی
ہیں رحمت اللعالمین
شافع بھی اور محمودؐ بھی
پھر آپ کی تعریف میں
رطب اللسان ہے خود خدا المطفیٰؐ المصطفیٰؐ
عشقِ رسولؐ مصطفیٰ

شاہدہ سحرؔ

غزل

در تو در ، سایۂ دیوار سے ڈر لگتا ہے
اپنا ہوتے ہوئے غیروں کا نگر لگتا ہے

دن نکلتے ہی اُمڈ آتے ہیں کالے سائے
کسی آسیب کا اس گھر پہ اثر لگتا ہے

خون آلودہ سبھی ہاتھ ہیں دستانوں میں
اب کے اندیشہ بہ اندازِدگر لگتا ہے

اوڑھنے روز نکلتی ہے رِدا زخموں کی
زندگی تیرا تو پتھر کا جگر لگتا ہے

کب سے امید کا کشکول لیے بیٹھے ہیں
آسرا کوئی اِدھر ہے نہ اُدھر لگتا ہے

جانے کب بحرِالم کس کو کہاں لے ڈوبے
اب تو ہنستے ہوئے یہ سوچ کے ڈر لگتا ہے

کھیلوں پہنائِ صحرا سے بگولے کی طرح
وسعتِ دشت میں کھو جاؤں تو گھر لگتا ہے

نجمہ یاسمین یوسف

خانہ بدوشوں کا ڈیرا

ایک بجے کا وقت تھا۔ بلقیس کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ گرمیوں کے دن تھے اور چاندنی رات۔ چھت پر ساتھ ساتھ بچھے ہوئے پلنگوں پر اس کے دونوں بھائی اماں اور باپ گہری نیند سو رہے تھے۔ جنوب کی طرف کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ بلقیس آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چھت کی جنوبی دیوار کی طرف گئی اور جھانک کر باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

مکان کے سامنے والے کھلے میدان میں دور دور تک ملگجے رنگ کے خیمے لگے ہوئے تھے جن کے اردگرد بے شمار اونٹ اور کتے نظر آ رہے تھے۔ اونٹ تو اپنی روایتی شرافت سے کام لیتے ہوئے آرام سے بیٹھے تھے مگر کتوں کو کسی طرح چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر لایعنی طور پر گھومتے اور چلاتے اور چلاتے اور پھر گھومنے لگتے۔ کوئی اٹھتا، کوئی بیٹھتا، کوئی کسی اونٹ سے ٹکراتا اور مسلسل بھونکتے جاتے۔

بلقیس کا گھر ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں شہری آبادی ختم ہو کر دیہاتی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ خیموں والے وسیع میدان کے دائیں بائیں اور آگے دور دور تک کھیت ہی کھیت نظر آ رہے تھے۔ جن کے درمیان کہیں کہیں دیوقامت درخت کھڑے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوا کے جھونکے آتے تو درختوں کی ڈولتی ٹہنیوں سے سرررر سرررر کی آوازیں آنے لگتیں۔ کسی کسی وقت دور سے نگہبانی کرنے والے کسان کی للکار سنائی دیتی اور کتوں کی ٹولی اور بھی زیادہ تندی سے بھونکنا شروع کر دیتی۔

چودھویں رات کے چاند کی دودھیا چاندنی نے ان ملگجے خیموں، وسیع کھیتوں، اونچے اونچے درختوں اور ڈولتی شاخوں کو کچھ ایسی دلفریبی بخش رکھی تھی کہ بلقیس بت بنی کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔

کئی دنوں سے اس میدان میں خانہ بدوشوں کا ایک گروہ آ کر اترا ہوا تھا۔ یہ لوگ اپنے اونٹوں، کتوں، خیموں اور معمولی ساز و سامان کو لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے ہیں خیمے گاڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد پھر

اپنے خیمے اور سامان اونٹوں پر لادتے ہیں اور کتوں کو ہمراہ لے کر کسی اور جگہ جا نکلتے ہیں۔

جس دن سے یہ لوگ اس میدان میں اترے تھے بلقیس دن میں کئی کئی دفعہ اپنی کھڑکی سے ان خیموں کو دیکھا کرتی تھی۔ اُسے خیموں کا نظارہ ہمیشہ سے بھلا لگتا تھا۔ اُس پر دُور سے بچوں اور جانوروں کی چہل پہل اُسے اور بھی زیادہ متاثر کرتی تھی۔ کئی دفعہ اُس کا دل چاہا تھا کہ قریب جا کر ان لوگوں کا حال چال دیکھے مگر ہر بات آئی گئی ہو جاتی تھی۔ آج چاند کی چاندنی میں یہ منظر اتنا پیارا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے وہاں جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

دوسرے دن دس بجے کے قریب وہ اپنی ماما کو لے کر خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی طرف چل پڑی۔ ڈیرا اُن کے گھر سے کوئی ستر گز کے فاصلے پر تھا۔ بلقیس اونچی نیچی زمین پر چڑھتی اترتی ڈیرے کی طرف جا رہی تھی کہ ماما بول اٹھی۔

''بیٹا، آپ کئی دنوں سے ان خیموں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔ شاید اس لیے کہ دور سے یہ بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یقین مانیے کہ قریب سے دیکھنے پر آپ ہرگز انھیں ویسا نہ پائیں گی۔''

بلقیس نے سمجھا کہ چونکہ میں بڑی بی کا کام چھڑوا کر ساتھ لائی ہوں اس لیے وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہیں مگر جب وہ ڈیرے میں داخل ہوئیں تو بلقیس محسوس کرنے لگی کہ ماما نے جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا۔

وہی ڈیرا جو رات کی پیاری پیاری چاندنی میں دور سے پریوں کا دیس معلوم ہو رہا تھا۔ دن کے وقت قریب آنے پر بھنگیوں کی بستی سے بھی گیا گزرا نکلا۔ چاروں طرف خاک، دھول اور غلاظت کے انبار لگے تھے۔ کیچڑ سے ملتے جلتے رنگ کے خیموں کے کونے مختلف اقسام کے چیتھڑوں سے بھرے ہوئے تھے۔ قسم قسم کے ٹوٹے ہوئے برتن ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ جگہ جگہ پانی سے کیچڑ ہو رہا تھا اور اس کے کنارے فوج در فوج مچھر بیٹھے تھے۔ کہیں کوئی موٹا کتا منہ کھولے زمین پر پڑا تھا۔ کہیں کوئی مسکین سا اونٹ بیٹھا سستی سے آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ بدبو کا وہ طوفان تھا کہ خدا کی پناہ اور لہنگوں والی خانہ بدوش عورتیں اور اُن کے ننگ دھڑنگ بچے ہاتھ پاؤں اور چہروں پر میل کی تہیں جمائے بے طرح شور وغل کر رہے تھے۔

غرض کہ چاروں طرف بدنظمی، بے ترتیبی اور گندگی

کا ایسا وحشت ناک منظر تھا کہ بلقیس کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بمشکل آدھا ڈیرا دیکھ سکی اور پھر گھبرا کر گھر کی طرف چل دی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے بڑا بھائی ماجد مل گیا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی ہنس پڑا۔ اُس نے کھڑکی میں سے اُسے ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا دیکھ کر آئی ہے۔

''کیوں بلو بیگم'' ماجد نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا کچھ تھا خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں۔''

''خاک، دھول، کچرا، مکھیاں، مچھر، اونٹ، کتے اور کیا کچھ بتاؤں۔'' بلقیس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ درحقیقت وہ ڈیرے کو دیکھ کر بے حد اُداس ہو رہی تھی۔

''مگر میری بہن ہمیں خانہ بدوشوں کے ڈیرے پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔'' ماجد نے کہا۔ ''جبکہ ہم خود بھی ایک ایسے ہی ڈیرے میں رہ رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' بلقیس نے کچھ حیران سا ہو کر پوچھا۔

''مطلب یہی ہے بھئی'' ماجد نے جواب دیا ''کہ ہماری یہ دنیا بھی تو خانہ بدوشوں کا ڈیرا ہی ہو کر رہ گئی ہے نا۔ ذرا دیکھو تو اس میں کتنی غلاظتیں اور گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ کہیں کمزور عقیدے کے لوگ خدا کو چھوڑ کر پیروں فقیروں کی نذریں مان رہے ہیں۔ کہیں زور والے کمزوروں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کسی گھر میں آقا نوکروں پر ستم توڑ رہے ہیں تو کہیں نوکر بے ایمانی سے آقاؤں کا مال اڑا رہے ہیں۔ جب چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں تو اُن کی محبوب گفتگو چغلی اور غیبت ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی رنجشوں پر عزیزوں سے تعلقات توڑے جاتے ہیں اور ذرا ذرا سے شک کی بنا پر معصوموں پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں۔ آخر یہ سب چیزیں ہمارے ڈیرے کی غلاظتیں ہی تو ہیں..... سمجھ رہی ہو!''

''ہاں۔ ہاں'' بلقیس منہ کھولے حیران کھڑی اس کی اس لمبی تقریر کو سن رہی تھی۔

''آپ خود ہی دیکھ لو نا'' ماجد نے اپنی بات پھر شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ ہمارے ارد گرد کتنی غلاظتیں ہیں مگر تو نے کبھی انھیں محسوس نہیں کیا۔ ہم میں سے اکثر انھیں محسوس نہیں کرتے۔ الٹی یہ دنیا ہمیں دلکش نظر آتی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح تمھیں چاندنی رات میں خانہ بدوشوں کا ڈیرا دلکش نظر آ رہا

تھا۔حالانکہ وہ ایک غلیظ اور میلی سی جگہ ہے۔سو بھئی جس طرح چاندنی اور دوری کے پردوں نے اس کے عیب ڈھانپ رکھے تھے اسی طرح ایک پردے نے ہماری دنیا کی گندگیوں کے عیب ڈھانپ رکھے ہیں۔جانتی ہو وہ پردہ کیا ہے؟''

''کیا ہے؟''بلقیس نے پوچھا۔

''بھئی وہ غفلت کا پردہ ہے۔ہم نے آنکھوں پر غفلت کی عینک لگا رکھی ہے۔اس کے دھوکا دینے والے شیشوں میں سے یہ غلاظتوں سے بھری دنیا ہمیں خوبصورت نظر آ رہی ہے۔اگر ہم اس غفلت کی عینک کو اتار ڈالیں اور ایمان کی روشنی میں اپنے اعمال کو قریب سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ کس طرح یہ گھر کوڑے کرکٹ سے بھر رہا ہے.....اور کس طرح ہم برائیوں کی خاک دھول میں بھتنے بنے گناہوں کی کیچڑ میں لوٹ رہے ہیں اور تمھیں ایک اور بات بتاؤں بلقیس؟''

''بتایئے۔''

''جس طرح تم خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں گئی ہو نا اسی طرح خدا کے فرشتے ہمارے ڈیرے میں آیا کرتے ہیں تم خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی غلاظتوں کو دیکھ کر اس قدر گھبرائیں کہ پندرہ منٹ بھی وہاں گزارنے مشکل ہو گئے۔خیال کرو کہ جب یہ پاک مخلوق ہمارے ڈیرے کی غلاظتیں دیکھتی ہو گی تو کیسی کچھ نہ گھبراتی ہو گی۔''

☆☆☆

بھنور کی آنکھ

''ہستی کیا ہے! جانتے ہو؟''

''بالکل، جانتا ہوں!''

''اور وجود کیا ہے؟''

''دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں!!''

''ان کی حیثیت کیا ہے یہ جانتے ہو؟''

''تمام خواہشات، خیالات، جذبات اور تگ و دو کا مرکز!''

''نہیں، نہیں'' میں نے چیخ کر کہا۔

''ہستی، ذات، وجود.....اور عدم.....سب ایک ہی چیز کے نام ہیں جو ابھی ہے اور ابھی نہیں!!!''

☆☆☆

سلویٰ معروف خاندان کی لڑکی تھی.....ظاہری طور پر کوئی عیب نہیں تھا۔ خوش شکل، خوش مزاج، پروفیشنل ڈگری ہولڈر، معاشرے کے اعلیٰ سرکل سے وابستہ .....خاندان ننھیال کرنیلوں جرنیلوں پر مشتمل تھی تو ددھیال نے سیاست اور تجارت میں خوب نام کمایا تھا۔

ریحان اسی علاقے کے سترھویں گریڈ کے لیکچرر کا بیٹا تھا.....قسمت کی یاوری تو میں اور آپ کہتے ہیں وگرنہ شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والا ہر فرد جانتا ہے کہ ایک ''امتحانی ہال'' کی بکنگ آٹھ دس لاکھ سے کم میں نہیں ہوتی.....ایک غلط کام نے دوسرے درجن بھر غلط کاموں کے راستے کھول دیے۔

پیپروں کی چیکنگ کا ریٹ دوسرے ملازمین والا لیکن ''خاص مارکنگ'' کا ریٹ سب سے بڑھ کر تھا۔

بورڈ میں پیپر بنانے والوں میں اس کا نام کیسے پہنچا؟ کون سردردی کا شکار ہوتا.....

اتنا تو اس معاشرہ میں سب نے دیکھا کہ پانچ مرلے کے مکان سے ڈیفنس کی دو کنال کی کوٹھی ہی نہیں بدلی، فرنیچر، گاڑی کا ماڈل یہاں تک کہ موبائل کے ماڈل تک بدل گئے .....لوگ سالوں بعد اپنی شناخت کا چولا اتار پھینکتے ہیں ادھر اس کام میں سال کیا مہینے بھی نہ لگے۔

ہر مشہور اکیڈمی اور ٹیوشن سنٹر میں ریحان کے والد اکبر سلیم چوہدری کا نام شامل ہوتا.....وزارتِ تعلیم تک

پہنچنا تو چند ہاتھوں کے فاصلے پر تھا۔

☆☆☆

جوڑ بلاشبہ آسمانوں پر بنتے ہیں مگر زمین پر سلویٰ اور ریحان کا جوڑ ایک میوزیکل کنسرٹ میں طے پایا..... منگنی کی بجائے ڈائریکٹ شادی کا پروگرام بنا ..... وجہ پیسے کی کمی نہیں سلویٰ کی بڑی بہن کی نجی مصروفیت تھی..... محض ڈیڑھ ماہ کے بعد شادی ہونا قرار پائی۔ ہر چیز بہترین ..... یہ دونوں خاندانوں کا ہدف بھی تھا اور ماٹو بھی۔ ریحان کا ایک کزن شوبز میں تھا لہٰذا خوب دھوم دھڑ کے سے شادی کا اعلان ہوا.....

جوڑ ریس شادی کے دن ولیمے میں ہوگا ویسا اس سے قبل لاہور شہر تو کیا پورے ملک میں کسی نے نہ پہنا ہو.....

ڈریس ڈیزائنرز نے سر جوڑ کر بالآخر ایک لہنگا منظور کروایا ..... درجن بھر ورکرز کی دن رات کی ان تھک محنت کے بعد جب وہ عروسی جوڑا تیار ہو کر آیا تو دن کا وقت تھا ..... کمرے کی تمام لائٹس آن کر کے جب اسے کھولا گیا تو ہر آنکھ چندھیا گئی۔

ریمپ پہ واک کرتی ماڈلز بھی اس ڈریس کے سامنے کہیں پیچھے رہ گئیں..... ''قلوپطرہ میں لز (ایلزبتھ ٹیلر) نے جس طرح ہر نظر کو مسحور کر دیا تھا ..... اس ڈیزائن کا آئیڈیا وہیں سے لیا گیا ہے۔'' ڈیزائنر نے کہا۔

چیک بک پہ سائن کر کے اکبر صاحب نے انھیں فارغ کیا۔

''میرا خیال ہے شادی کی شاپنگ کے لیے ایک ورلڈ ٹور نہ ہو جائے۔'' دولت کا نیا نیا مزہ چکھنے والی بیگم اکبر نے کہا۔

''پیسے کا تو نہیں وقت کی تنگی کا مسئلہ ہے۔'' اکبر صاحب نے کہا۔

''پھر بھی جو مزہ لندن اور امریکہ کے سٹورز اور شاپنگ مالز میں ہے وہ.....'' بیگم صاحبہ نے اصرار کیا۔

''ایسے کرو یہ کونٹیکٹ نمبر لے لو، فرحان اور اس کی مسز وہاں سے شاپنگ کر دیں گے، واقعی وقت کم ہے.....''

پھر دبئی کے ٹرپ پر اکتفا کیا گیا اور کچھ کراچی، لاہور، اسلام آباد کی مارکیٹیں کام آئیں۔ زیادہ تر شاپنگ کے لیے سلویٰ ہونے والی ساس کے ہمراہ تھی۔ میک اپ، جوتے، جرسیوں اور ہینڈ بیگز کی خریداری پونڈز، ڈالرز میں ہوئی۔

محاورتاً نہیں حقیقتاً سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی ..... پی ایم اور پریذیڈنٹ سے لے کر کلرک تک مدعو تھے۔ ڈیڑھ ماہ بس پلک جھپکنے کی مانند گزر گیا۔ ملک کے مشہور فوٹو گرافرز، صحافی برادری سے تعلق رکھنے والا نمایاں طبقہ بھی موجود تھا۔

آنے والوں کے لیے میرج کلب سے ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے تک گلاب کی پتیاں فرشِ راہ کی گئیں۔

ہر اہم وزیر مشیر کی آنے کی خبر کنفرمڈ تھی۔

''نکاح تو ہوا ہی ایسا کہ جیسے کی توقع کی جا سکتی تھی..... ولیمہ بس بالکل غیر متوقع ہو!'' بار بار زیر لب مسکرا کر اکبر صاحب اپنے آپ کو مخاطب کرتے۔

دیکھنے والوں نے ایسا فنکشن کبھی نہ دیکھا تھا۔ وفاقی وزیر تعلیم یا وزیر مملکت، دونوں میں سے ایک عہدے کے حصول کے لیے آج سب کچھ داؤ پر لگا دیا گیا تھا۔

ڈنر سوٹ میں اکبر صاحب مسکرا مسکرا کر سب کا استقبال کرتے ہوئے آج واقعی شہنشاہ اکبر لگ رہے تھے! وزیر اعظم کے بیٹے کی شادی پر اکبر صاحب نے گاڑی سلامی میں دی تھی جواب الجواب دلہا دلہن کے لیے سب نے بے حد قیمتی تحائف دیے.....

کچھ لوگ اس پرفیکٹ جوڑے، بے مثال شادی اور متوقع وزارت پر خوش تھے تو حاسدین اور ناقدین کی بھی کمی نہ تھی..... البتہ دلہن کے حسن کو سب نے سراہا۔ کسی کو اس کی مسکراہٹ لیڈی ڈیانا جیسی لگی تو کسی کو میڈونا جیسا فیس کٹ لگا۔

''جتنی رقم اس دعوت ولیمہ پر لگی اور جتنے میں یہ عروسی جوڑا تیار کیا گیا اتنے میں تو ڈیفنس میں ایک اور فرنشڈ گھر مل جاتا!!'' کہنے والوں نے دل کھول کر ''مبارکباد'' کے الفاظ کہے۔

جب دسمبر کی آخری بھیگی راتوں میں ایک رات اور بھیگ چلی تھی!

جب صدر صاحب کے فقروں میں سے وزارت ملنے کے حوصلہ افزا فقرے کشید کیے جا رہے تھے..... برسوں یاد رکھی جانے والی اس شادی کو پتہ نہیں کیسے نظر لگ گئی۔

میرج کلب سے نکلتے ہی پہلے ٹرن پر کیسے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔

ماہر تجربہ کار ڈرائیور کے ہاتھ کیسے کانپے۔ بظاہر کسی بھی وجہ کے نہ ہوتے ہوئے بھی گاری کیسے

حادثے کا شکار ہوگئی.....

جواب کسی کے پاس نہ تھا!

ریحان نے گاڑی میں آخری سانس لیتے ہوئے

ضرور سوچا ہوگا..... یہ تھی زندگی؟؟

ڈرائیور نے مرتے وقت کیا سوچا ہوگا.....شاید یہ

کہ اتنے سال کے تجربہ کار ہاتھ کیسے دھوکہ کھا گئے؟

اور سلویٰ..... دونوں ٹانگیں اور ریڑھ کی ہڈی

ٹوٹنے کے بعد جب ہسپتال میں ڈاکٹر نے کہا۔

''چوہدری صاحب آپ کی بہو ساری زندگی کے

لیے معذور اور مفلوج ہوگئی ہے ..... ایک آنکھ سے

محرومی کا دکھ اتنا نہ ہوگا جتنا اس معذوری کا.....''

''یہ ہے بے بسی!!!'' تب بہو کی حالت دیکھ کر

اکبر سلیم صاحب نے بھی دل ہی دل میں کہا ہوگا.....

اور ہستی کی اوقات کیا ہے؟

☆☆☆

ارمان

جونہی ذکیہ بیگم کی سانس کی ڈور ٹوٹی، ان کے آس پاس موجود سب افراد نے سکھ کا سانس لیا۔ ان کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے گزشتہ دو ڈھائی سال سے وہ سب ذکیہ بیگم کی جیتی جاگتی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے۔ آج اچانک یہ لاش سرک گئی تھی اور ان کے کندھے اس بوجھ سے آزاد ہو گئے تھے۔ اس آزادی کا احساس ہوتے ہی انہوں نے گردنیں گھما کر ایک دوسرے کو کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو یقین دلا رہے ہوں کہ ذکیہ بیگم اب کبھی لوٹ کر ان کی دنیا میں واپس نہیں آئیں گی۔ پھر بڑی بہو نے اپنے میاں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا، کفن خریدنے جاؤ گے تو ساتھ ہی گلاب کے پھولوں کی ڈھیر ساری پتیاں ضرور لیتے آنا۔ امی کو گلاب کی خوشبو بہت پسند تھی۔''

منجھلی رقت طاری کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''اجی سنیے! ذرا جا کر مدرسے سے کچھ بچوں کو لے آیئے۔ یہاں بیٹھ کر وہ قرآن خوانی کرتے رہیں گے تاکہ امی کی روح کو سکون ملے۔''

چھوٹی بہو نازیہ نے اپنے دوپٹے کو سر پر جماتے ہوئے اعلان کیا۔

''میں نہلانے والی ماسی کو لینے جا رہی ہوں۔ میت کو نہلانے کی ذمہ داری میری ہے۔''

طاہرہ نے حیران ہو کر تینوں بھابھیوں پر نظر ڈالی۔ نہ جانے ان کے دلوں میں اچانک ذکیہ بیگم کے لیے خوابیدہ محبت کیسے بیدار ہو گئی تھی۔ پھر اس نے اپنی ماں کے بے جان چہرے کو دیکھا۔ اس کے دل سے ہوک اٹھی اور وہ سوچنے لگی کہ زندگی کے آخری دنوں میں امی اسی خیر خواہی کو ترس کر رہ گئی تھیں لیکن اب توجہ کا مرکز بن کر وہ سب کی ہمدردی سے بے نیاز ہو گئی ہیں اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ اسے بھی اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہر وقت امی کی فکر لاحق رہتی تھی کہ نہ جانے امی نے کچھ کھایا ہو گا یا نہیں؟ خدا جانے رات بھر نیند آئی ہو گی یا نہیں؟ اللہ جانے درد کو افاقہ ہوا یا

نہیں؟ خدامعلوم کتنی دفعہ دل ہی دل میں مجھے پکارا ہوگا؟ کسی نے ان کی پیاس کو بجھایا ہوگا یا نہیں؟

تو آج وہ بھی ان سب فکروں سے آزاد ہوگئی تھیں۔ امی سب رشتوں سے منہ موڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی تھیں۔

ذکیہ بیگم پچھلے کچھ عرصہ سے علیل تھیں۔ان کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے پچک گئے تھے، جس کی وجہ سے چلنا پھرنا دشوار ہوگیا تھا۔ اور وہ بستر کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھیں۔ ہروقت بیٹھے یا لیٹے رہنے کی وجہ سے وزن بھی بے تحاشہ بڑھتا چلا جارہا تھا اور یہ موٹاپا انہیں اندر ہی اندر سے کھوکھلا کررہا تھا۔

شروع شروع میں تو وہ لاٹھی کا سہارا لے کر بمشکل غسل خانے تک چلی جاتی تھیں لیکن کچھ عرصے کے بعد لاٹھی کے ساتھ ساتھ انسانی سہارے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی لیکن جلد ہی یہ سب سہارے بیکار ہوگئے۔انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا اور بستر پر لیٹے لیٹے موت کی راہ دیکھنے لگیں۔

ذکیہ بیگم تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں تھیں۔سب بچے شادی شدہ تھے۔ بڑی بہو ڈاکٹر تھی اور منجھلی بہو ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔ چھوٹے بیٹے عامر کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ دونوں بڑے بھائیوں کی شادی کے بعد جب عامر کی باری آئی تو اس کی خواہش کے مطابق ذکیہ بیگم نے اس کی شادی ایک دیندار گھرانے میں کردی اور وہ نازیہ کو بہو بنا کر لے آئیں۔

بیٹوں کی شادیوں کے باوجود ذکیہ بیگم نے گھر کی بیشتر ذمہ داریاں بخوشی اٹھائی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ جب تک ان میں دم خم موجود ہے وہ اپنے بچوں کو ہرممکن سہولت بہم پہنچائیں۔ان کے رویے کی وجہ سے اہل خانہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔ وہ گھر کا نظام بہت سلیقے سے چلا رہی تھیں اور کسی قسم کا مسئلہ نہ تھا۔ دونوں بڑی بہویں روزانہ صبح اپنی اپنی ملازمت کے سلسلہ میں گھر سے نکل جاتیں۔ واپس آکر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اپنے اپنے بچوں کو ہوم ورک کروانے بیٹھ جاتیں۔ رات کو ٹی وی پروگرام دیکھے جاتے اور دن کا اختتام ہوجاتا۔

نازیہ محلے میں ہردلعزیز تھی۔ وہ گاہے بگاہے خواتین کو درس دیتی۔ محلے میں کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے چلی جاتی۔کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا

تو وہ ہر ممکن مدد کے لیے آمادہ ہوتی ۔ کسی کو کوئی مشورہ درکار ہوتا تو وہ حاضر ہوتی ۔ کسی کی شادی کا موقع ہوتا تو بڑھ چڑھ کر خریداری اور سلائی کے کاموں میں حصہ ڈالتی ۔ کسی بچے کو پڑھائی کے سلسلہ میں کوئی مشکل پیش آتی تو وہ نازیہ بھابھی کے پاس بھاگا چلا آتا ۔ غرض وہ دونوں بڑی بھابھیوں سے کہیں بڑھ کر مصروف تھی اور محلے بھر کی آنکھوں کا تارا تھی ۔ بعض اوقات عامر اس کی ایسی بے پایاں مصروفیات کی وجہ سے چڑ جاتا اور اسے کہتا ۔

''بیگم صاحبہ! اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت اس غریب خانے کو بھی دے دیا کریں ۔ آپ کی عنایت ہوگی ۔''

لیکن ایسے موقع پر ذکیہ بیگم آڑے آجاتیں ۔

''گھر کے سب کام بآسانی ہو رہے ہیں ۔ اگر کبھی مجھے ضرورت ہوگی تو لامحالہ نازیہ کو ہی مدد کے لیے پکاروں گی ۔ فی الحال کوئی مسئلہ نہیں ۔ اس لیے تم خواہ مخواہ اس کی مصروفیت پر اعتراض نہ کیا کرو ۔''

ذکیہ بیگم کی حمایت پا کر نازیہ مسکرا اٹھتی اور عامر خاموش ہو جاتا ۔

غرض جب تک ذکیہ بیگم تندرست رہیں، روزمرہ کے سب کام خوش اسلوبی سے ہوتے رہے اور ان کی سلیقہ شعاری سے سب فیض یاب ہوتے رہے ۔ لیکن جب ان کی ہمت جواب دے گئی تو آہستہ آہستہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کنارہ کش ہوتی چلی گئیں ۔ چنانچہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو کھانا پکانے کے لیے رکھ لیا گیا ۔ ذکیہ بیگم باورچی خانے میں کرسی بچھا کر بیٹھ جاتیں اور اپنی نگرانی میں اس سے کام کرواتیں لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر تک نہ چل سکا ۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ان کے لیے کرسی پر بیٹھنا بھی دشوار ہو گیا تو وہ بستر سے جا لگیں ۔ باورچی خانہ کیا لاورث ہوا گھر کا نظام ہی تلپٹ ہو کر رہ گیا ۔ اب سب کے لیے بے فکری سے بروقت اور من پسند ناشتے کی دستیابی بھی مسئلہ بن کر رہ گئی لیکن جلد ہی گھر والوں نے اس نئی صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا اور جوں توں گزارا کرنے لگے ۔

شروع شروع میں سب نے ذکیہ بیگم کی خبر گیری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن جوں جوں بیماری کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا، توں توں اہلِ خانہ ان کی طرف سے غافل ہو کر اپنی اپنی مصروفیات میں گم ہوتے چلے گئے ۔

ذکیہ بیگم کی علالت کی ابتدا کے دوران بڑے بیٹے نے ان کے علاج پر اٹھنے والے تمام تر اخراجات کی ذمہ

داری اٹھائی لیکن چند ماہ کے بعد جب اس کی بیوی نے اس کی توجہ مبذول کروائی تو وہ بھی تذبذب کا شکار ہوکر رہ گیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''اجی! ہمیں چاہیے کہ ہم ابھی سے اپنے بیٹے کی تعلیم اور بیٹی کے جہیز کے لیے ہر ماہ کچھ پیسے پس انداز کرلیا کریں۔ اگرچہ بیٹی آج چھوٹی ہے لیکن وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ کل شادی کے لیے زیور درکار ہوگا۔ جانتے ہو سونے کی قیمت آسمان کو چھو رہی ہے۔ آج پیسے بچاؤ گے تو کل کام آئیں گے۔''

یہ کہہ وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر رسان سے کہنے لگی۔

''توبہ! آج کل دوا دارو بھی کس قدر مہنگا ہوگیا ہے۔ ہماری آمدنی کا خاصا بڑا حصہ تو امی کے علاج پر ہی اٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ اصولاً تو سب بھائیوں کو مل کر یہ ذمہ داری اٹھانی چاہیے۔ وہ سب کی ماں ہیں، صرف تمہاری تو نہیں ادھر سے کچھ رقم بچ جائے تو ہم وہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔''

وہ اپنی بیوی کی عقلمندی اور دوراندیشی کا قائل تھا۔ اب اس کا مشورہ سن کر دل ہی دل میں نادم ہوگیا کہ وہ ماں ہو کر اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے کیسے پیش بندی کر رہی ہے اور وہ باپ ہوکر بھی اس انداز سے نہیں سوچ رہا تھا۔

چنانچہ اب اس نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ وہ کس طرح اپنے بھائیوں کو بھی اس کارِ خیر میں شریک کرکے اپنا دامن بچالے۔ جلد ہی اسے حل مل گیا۔ وہ بازار سے جَست کا بنا ہوا پیسے جمع کرنے والا ایک گلہ خرید لایا اور اسے ٹی وی لاؤنج کے ایک کونے میں رکھی گئی ایک گول تپائی کے اوپر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں بھائیوں کو بلا کر کہا۔

''اب ہم تینوں اس گلے میں حسبِ استطاعت پیسے ڈال دیا کریں گے۔ جب امی کے دوا خریدنے کی ضرورت ہوگی، اس میں سے پیسے نکال کر استعمال کرلیا کریں گے۔''

بڑے بھیا کی تجویز عامر کو گراں گزری۔ اس نے سوچا کہ اب ماں کا علاج بھی چندے کی رقم سے کیا جائے گا؟ اس کا دل چاہا کہ وہ اس گلے کو اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دے لیکن وہ ایسا نہ کرسکا کیونکہ ذکیہ بیگم نے اسے ہمیشہ بڑے بھیا کے سامنے مودب رہنا ہی سکھایا تھا۔ اس نے دبے لہجے میں صرف اتنا کہا۔

''بڑے بھیا! آپ فکر نہ کریں۔ امی کے علاج

کے لیے میرے پاس کچھ رقم موجود ہے وہ پیسے جب ختم ہوجائیں گے تو پھر جیسا آپ کا دل چاہے ویسا ہی کر لیجیے گا۔''

لیکن بھیا نے کمال فراخدالی سے اس کی پیش کش کو رد کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی نہیں! وہ ہم سب کی ماں ہیں۔ اس لیے ان کے دوادارو کا خرچہ ہم سب کو مل جل کر ہی اٹھانا چاہیے۔ اصول اور انصاف کا یہی تقاضا ہے۔''

یہ کہہ کر بھیا نے عدالت برخاست کر دی اور عامر گہری سوچ میں کھو گیا۔ نازیہ دونوں بھائیوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ بڑے بھیا کے جانے کے بعد وہ عامر کے نزدیک آئی اور سمجھانے بیٹھ گئی۔

''دیکھو! بڑے بھیا کی تجویز بہت اچھی ہے۔ وہ تم سب کی ماں ہیں اور تم سب کو مل کر ہی اس کام کا بیڑا اٹھانا چاہیے۔ تم ان کے علاج کے تمام تر اخراجات اپنے ذمہ لے کر اپنے بھائیوں کو اس نیکی سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہو؟ حالانکہ نیکی کے کاموں میں ہمیں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔''

عامر دکھی لہجے میں کہنے لگا۔

''ہم نے امی کی خدمت اور ایثار کا فیض سالہا سال پایا ہے۔ انہوں نے اپنے وسائل، وقت اور صلاحیتوں کا بہترین حصہ ہماری نذر کر دیا اور اب ہم اپنی آمدنی کا کمترین حصہ بھی ان پر خرچ کرنے کے لیے کس کرب سے گزر رہے ہیں۔ بڑے بھیا ہمیشہ سے امی کی کمزوری تھے۔ اگر کبھی عزیز و اقارب یا پڑوس کی طرف سے ان کا پسندیدہ کوئی کھانا یا تحفہ گھر میں آجاتا تو اکثر امی ان ہی کو دے دیا کرتیں۔ اس وقت وہ بھول جاتے تھے کہ وہ ہم دونوں بھائیوں کی بھی ماں ہیں۔ اب اچانک ان کو کیسے یاد آ گیا کہ ہم بھی ان کے بیٹے ہیں۔ عجب ماجرا ہے اب وہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کی ماں ہیں۔ تم بھی اعلان کرتی ہو کہ وہ ہم سب کی ماں ہیں۔ تمہاری یاددہانی کا شکریہ۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں جب شعور کی آنکھ کھولی تھی تو سب سے پہلے اسی حقیقت کو جانا تھا، بے لوث محبت کے اسی پیکر کو پہچانا تھا۔''

یہ کہتے کہتے عامر کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس کی آواز بھرا گئی۔

بیماری کے ابتدائی دنوں میں ذکیہ بیگم پُر امید تھیں کہ وہ جلد ہی صحت یاب ہو کر حسب سابق اپنی ذمہ

داریاں سنبھال لیں گی لیکن جب مرض میں افاقے کی بجائے اضافہ ہوتا چلا گیا تو انہوں نے بھی امید کا دامن چھوڑ دیا۔ جب گھر والے بھی ان کی طرف سے غافل ہو گئے تو بیماری کے ساتھ ساتھ انہیں تنہائی بھی ڈسنے لگی۔

عامر ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ صبح گھر سے نکلتا اور شام ڈھلے تھکا ہارا واپس آتا۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھا ذکیہ بیگم کے کمرے میں جا کر ان کا حال احوال پوچھ کر اپنے کمرے کا رخ کرتا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک جز وقتی ملازمہ رکھ لی گئی تھی جو گھر کے کاموں میں زیادہ مصروف رہتی اور ذکیہ بیگم کی ضروریات کا بھی مقدور بھر خیال رکھتی۔ ملازمہ کو ذکیہ بیگم کا کمرہ پسند نہیں تھا۔ گھر میں اس کمرے کی حیثیت ایک ہنگامے اور شورش سے بھرپور سمندر کے ایسے جزیرے کی سی تھی، جہاں اداسی اور ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اس کمرے کے باہر زندگی کی رونق اور توانائیاں بکھری پڑی تھیں۔ اس لیے ملازمہ کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ انتہائی ضرورت اور مجبوری کے تحت ہی اس کمرے میں داخل ہو اور کم سے کم وقت وہاں ٹھہر کر جلد از جلد وہاں سے نکل آئے۔ یوں ذکیہ بیگم کی تنہائی بڑھتی چلی گئی۔ ان کے لیے دن پہاڑ کی طرح بوجھل اور طویل ہو جاتا اور ہر رات صدیوں کی طوالت لے کر آتی۔

ایک دن مہترانی گھر کی صفائی کر رہی تھی۔ اسی دوران اس نے دروازہ کھولا تو ایک بھولی بھٹکی چڑیا اڑتی ہوئی گھر کے اندر ذکیہ بیگم کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں جا کر وہ بیقراری سے ایک کونے سے دوسرے کونے میں چکر لگانے لگی۔ چند چکر لگا کر وہ تھک کر نڈھال ہو گئی اور سانس لینے کے لیے کمرے کی دیوار پر چھت کے قریب لگے ہوئے سپلٹ کے اوپر بیٹھ کر حیران ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ ذکیہ بیگم کے کمرے کا جمود ٹوٹا۔ انہیں اپنے کمرے میں چڑیا کی آمد بہت اچھی لگی۔ انہوں نے محبت سے اسکی طرف دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہو گئیں۔

''خوش آمدید! منی چڑیا کیسی ہو؟ باہر کا موسم کیسا ہے؟ کیا باہر کی دنیا میں اب بھی بادل گرج کر برستے ہیں؟ کیا دھوپ پہلے جیسی ہی چمکیلی ہے؟ کیا ہوائیں بھی مشکبار ہیں؟ کیا چاندنی اب بھی آسمان سے چھن چھن کرتی ہوئی زمین پر اتر کر ویسے ہی بکھر جاتی ہے؟ کیا رنگ برنگے اور خوبصورت پھول اپنے حسن اور خوشبو کے ساتھ اب بھی چمن میں جلوہ آرا ہیں؟ کیا روزانہ علی الصبح باغ میں قسم قسم کے

پرندے اکٹھے ہوکر بھانت بھانت کی بولیاں بول کر اپنے خالق کی حمد وثنا کرتے ہیں؟ اور چڑیا رانی! تمہیں یاد ہے کہ میں روزانہ صبح سویرے تمہارے لیے مٹی کے برتنوں میں باجرہ اور پانی رکھ دیا کرتی تھی۔ نہ جانے اب کوئی تمہارے دانے دنکے کا خیال رکھتا ہے یا نہیں؟ اللہ جانے اب خوراک کی تلاش کے لیے تمہیں کتنی لمبی اڑان بھرنا پڑتی ہے؟''

ذکیہ بیگم یونہی چڑیا کے ساتھ محو گفتگو تھیں کہ بچوں کو بھی اس کی موجودگی کی خبر ہوگئی اور وہ خوشی سے شور مچاتے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ اس ہنگامے کی وجہ سے ذکیہ بیگم کے سوئے سوئے، تنہا اور ویران کمرے میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ وہ اپنی بیماری کو بھول کر باری باری بچوں کے خوش سے تمتماتے ہوئے چہروں کو دیکھتی چلی جارہی تھیں اور ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت تھم جائے لیکن جلد ہی بچوں کا شور سن کر منجھلی بہو کمرے میں آئی اور ڈانٹ ڈپٹ کر ساتھ لے گئی۔ چڑیا کو بھی ان کے کمرے سے بے دخل کر دیا گیا۔ اب پھر کمرے کے وہی چپ چاپ سے ساکت وجامد در ودیوار تھے، وہی وحشت تھی اور وہی تنہائی۔ ذکیہ بیگم کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے اور انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

عامر دفتر سے واپس آیا تو سیدھا ذکیہ بیگم کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں ہلکے ہلکے کراہ رہی تھیں اور ان کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ عامر نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو حدت کی وجہ سے احساس ہوا کہ انہیں تو تیز بخار نے آلیا ہے۔ اس نے گھبرا کر ان کو پکارا۔ ذکیہ بیگم نے بمشکل آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ عامر ان کی نظروں میں چھائی ہوئی بے بسی کی تاب نہ لا سکا اور اس نے آنکھیں جھکا کر پوچھا۔

''امی! آپ کو تو بخار ہے۔ کیا آپ نے دوا لی ہے؟''

وہ منہ سے کچھ نہ بولیں۔ بس دائیں ہاتھ کی انگلی سے نہ کا اشارہ کر دیا۔ عامر نے میز پر رکھی ہوئی رنگ برنگی دوائیوں میں سے ایک بوتل اٹھا کر اسے کھول کر چمچے میں دوا انڈیلی اور آہستہ آہستہ ان کو پلا دی۔ پھر وہ پلنگ پر بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد نازیہ کمرے میں داخل ہو کر اسے کہنے لگی۔

''میں نے تمہارا کھانا میز پر چن دیا ہے۔ اٹھو کھانا کھالو۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے اکتائے لہجے میں کہا۔

نازیہ نے چونکہ اپنا فرض ادا کر دیا تھا اس لیے اصرار نہ کیا۔

کچھ دیر کے بعد ذکیہ بیگم کی حالت قدرے بہتر نظر آنے لگی اور وہ ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگیں۔ عامر ان کی طرف سے قدرے مطمئن ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو وہاں برآمدے میں نازیہ آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسکی پالتو بلی اس کی گود میں آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی اور نازیہ بہت محبت سے اسکی پشت سہلا رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر عامر سے رہا نہ گیا اور وہ بے اختیار بول اٹھا۔

''نازیہ! کاش تم امی کا صرف اتنا ہی خیال کر لیا کرو جتنا اس خوش نصیب بلی کا کرتی ہو۔ مانا کہ ان سے تمہارا کوئی خونی رشتہ نہیں۔ محبت اور الفت کا رشتہ نہیں، ہم عمری کا رشتہ نہیں لیکن انسانیت کا رشتہ تو ہے نا..... اسی رشتے کے ناطے۔ اسی رشتے کے واسطے.....''

نازیہ نے اپنی نظریں بدستور بلی پر مرکوز کیے رکھیں اور سپاٹ لہجے میں کہنے لگی۔

''عامر! میں انسانیت کے رشتوں کو نہیں مانتی۔ یہ رشتہ تو ہمارا ملازموں اور مجرموں کے ساتھ بھی ہوتا ہے تو کیا وہ بھی ہماری توجہ اور محبت کے مستحق ہو جاتے ہیں؟ میں تو رشتوں کو دین کی روشنی میں پرکھتی ہوں اور میرے دین نے مجھ پر تمہاری ماں کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ وہ تمہاری ماں ہیں، تم ذمہ دار ہو ان کے۔ تم ان کی جی جان سے خدمت کرو۔ تمہیں کس نے روکا ہے؟ اپنا ملبہ دوسروں پر کیوں گراتے ہو؟''

نازیہ کی بے حسی دیکھ کر اور اس کی تلخ گوئی سن کر عامر ضبط نہ کر سکا۔ کہنے لگا۔

''یہ تم کس دین کا پرچار کرتی ہو؟ میں کیسے مان لوں کہ جو دین، دینِ فطرت ہو، جس نے زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے لیے بنی نوعِ آدم کی رہنمائی کی ہو، جو دین انسانوں کو جانوروں کے حقوق سے آگاہ کرے، جو دین ہمسائے کے حقوق سے آگاہ کرے، جو پہلو کے ساتھی اور سفر کے ساتھی کے بارے تلقین کرے، جو رشتہ داروں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے پر اکسائے، جو اجنبی سوالی کے ساتھ حسن سلوک کرنا سکھائے، جو بھوکے کا پیٹ بھرنا سکھائے، جو دوستی کے انداز سکھائے، جو دشمنی کے آداب سمجھائے، جو پھلدار درختوں اور نباتات کے حقوق سے روشناس کرائے، جو میاں بیوی کے حقوق وفرائض واضح کرے، بہن بھائیوں کے آپس کے تعلقات پر روشنی ڈالے، جو حاکم کے فرائض سے آگاہ

کرے، جو محکوم کے حقوق سمجھائے، جو ظالم کا ہاتھ پکڑنا سکھائے، جو مظلوم کی مدد کرنے کا حکم دے، جو مسافر کے لیے آسائش کی نوید ہو، جو آزادی کے حدود قیود کا تعین کرے، جو قیدی کے لیے بھی حسن سلوک کا حکم دے، جو کمزوروں کو جائے پناہ دے اور طاقتور کو جھکنا سکھا دے، بیمار کے حقوق، قرضدار کے حقوق، یہاں تک کے مردہ انسانوں کے حقوق، ان سب کی وضاحت جو خوب کھول کھول کر بیان کر دے تو کیا ایسا دین صرف ساس سے ہی لاتعلقی اور بے مروتی کا سبق دیتا ہے۔ ناممکن ہے یہ ناممکن۔''

''عامر! تمہاری اس جذباتی تقریر سے دین کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسکی رو سے تمہاری ماں کی دیکھ بھال میری ذمہ داری نہیں۔ میرے لیے وہ تمہاری ماں ہیں اور بس۔'' نازیہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

عامر روہانسا ہو کر کہنے لگا۔

''دیکھو نازیہ! میری ماں میری جنت ہے۔ تم میری جنت کی توقیر نہیں کر سکتی تو اسکی تذلیل بھی نہ کرو۔ کیا یہ تمہارا فرض نہیں کہ میری خوشی اور میرے سکون کا خیال رکھو۔ سوچو تو سہی تم میری شریکِ حیات ہو۔ میری اعانت کرو تا کہ میں سکون اور اطمینان سے رزقِ حلال کے حصول کی کوشش میں لگا رہوں۔ امی کی معذوری کی وجہ سے میں ذہنی طور پر اس قدر پریشان رہتا ہوں کہ دفتر میں کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ دل چاہتا ہے کہ نوکری چھوڑ کر خود ان کی خدمت کروں۔ میں ڈرتا ہوں کہ نہ جانے کب ان کی سانس کی ڈور ٹوٹ جائے اور پھر کہیں میں ساری زندگی کے لیے حسرت اور پچھتاوے کا شکار نہ ہو کر رہ جاؤں۔''

اب نازیہ چمک کر کہنے لگی۔

''نوکری چھوڑنے کا خیال تمہیں کیونکر آیا۔ میں اور بچے تمہاری ذمہ داری ہیں جیتے جی تم اس ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کر سکتے۔''

عامر کہنے لگا۔

''ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو لیکن مجھے سمجھاؤ کہ میں کیا کروں۔ امی میری ذمہ داری ہیں اور ان کی دیکھ بھال میرا فرض ہے۔ تمہاری ذمہ داری کی وجہ سے نوکری کرنا بھی لازم ہے۔ میں یہ دونوں کام بیک وقت کیسے کر سکتا ہوں؟ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ سوچو تو سہی کہ تمہارے بہن بھائیوں کے آڑے وقت میں تمہاری خوشی کی خاطر میں مقدور بھر ان کے کام آتا ہوں۔ کیا یہ مجھ پر فرض ہے؟ میری جان! ہم

دونوں کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو حتی الوسع خوش رکھیں۔ اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں کہ ساس ہونے کے ناطے تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں تو اس کے باوجود جب ہم ایک گھر میں ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں تو کیا ان کو پڑوسی کی حیثیت سے دے کر ان سے حسن سلوک نہیں کیا جاسکتا؟ تم جانتی ہو کہ ہمیں زمین والوں پر رحم کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا وہ اہلِ زمیں میں سے نہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور جو شخص اس کے کنبے کا خیال رکھتا ہے، وہ اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ میری ماں بھی اسی کنبے کا فر دہے۔ دیکھو دین کا نام لے لے کر لوگوں میں بدگمانیاں اور دوریاں پیدا نہ کرو۔ ہاں دین کا نام لے کر آس پاس کے لوگوں میں محبتیں اور خلوص بانٹو۔ اور اس نیکی کی ابتدا اپنے گھر سے کرو۔''

اب نازیہ بھڑک اٹھی۔

''واہ عامر صاحب واہ! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے کم ظرف نکلو گے۔ کیا ہوا اگر کبھی تم میرے بہن بھائیوں کے کام آ گئے۔ وہ بھی تو تمہاری محبت کا دم بھرتے ہیں۔ اپنی ماں کی ایسی ہی فکر ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شہر میں کئی oled home peoples کھل چکے ہیں۔ وہاں داخل کروا دو ان کو۔ وہ لوگ بوڑھوں کی بہت اچھی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جب تمہارا دل چاہے تم ان کو ملنے وہاں چلے جایا کرنا۔''

نازیہ کی تجویز سن کر عامر کے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن وہ اپنے غصے کو پی گیا۔ اور دکھی ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔

بہو اور بیٹے کی تیز و تند آوازیں سن کر ذکیہ بیگم کی آنکھ کھل گئی اور نازیہ کی تجویز سن کر لرز اٹھیں۔ وہ اپنی بیماری کو بھول گئیں اور اسی خوف کا شکار ہو کر رہ گئیں کہ نہ جانے عامر کا ردِعمل کیا ہوگا؟ کہیں وہ کسی اولڈ ہوم کی طرف تو نہیں جا نکلا؟ کہیں اب مجھے اٹھا کر وہاں تو نہیں پھینک دیا جائیگا؟ میری موت جواب میرے سرہانے کھڑی ہے، کہیں ایسی بے بسی اور بے چارگی کی حالت میں تو مجھے نہیں آن لے گی؟ اجنبی ماحول، انجان در و دیوار، ناشناس اور نامہربان چہروں کے درمیان!

یہ سوچتے سوچتے ذکیہ بیگم کا ذہن شل ہو رہا تھا۔ وہ رونا چاہ رہی تھیں لیکن آنسوؤں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک ٹک چھت کو گھورتی چلی جا رہی تھیں اور دل ہی دل میں اپنے مرحوم شوہر کی خوش بختی پر رشک کر رہی تھیں کہ ایسی نوبت کے آنے سے پہلے ہی

وہ عزت واحترام کے ساتھ چل بسے تھے۔

وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھیں کہ انہیں اپنی مونس اور غمخوار بیٹی طاہرہ کی آواز سنائی دی۔ طاہرہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی اور حسبِ معمول اس نے جھک کر ان کی پیشانی چوم لی۔ طاہرہ کی شکل دیکھتے ہی نہ جانے کیوں ان کے رکے ہوئے آنسو ساون بھادوں کی طرح بہنے لگے۔ طاہرہ نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور بیقراری سے کہنے لگی۔

''امی! کیا ہوا؟ آپ کا یہ روپ تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ زندگی کی آزمائشوں کو آپ نے صبر سے سہہ لیا۔ اس بیماری کا مقابلہ بھی آپ کے کمال ہمت اور حوصلے سے کر رہی ہیں۔ پھر آج ایسی کیا خاص بات ہوگئی کہ آپ ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ رہا ہے؟''

''کچھ بھی تو نہیں۔ ویسے ہی آج میں تم کو بہت یاد کر رہی تھی کہ اچانک تمہیں اپنے سامنے پا کر مجھے خود پر اختیار نہ رہا۔'' ذکیہ بیگم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

طاہرہ نے بھانپ لیا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چنانچہ ان کا دھیان بٹانے کے لیے طاہرہ نے پرانے قصے چھیڑ دیئے۔

''امی! آپ کو یاد ہے کہ بچپن میں ایک دفعہ بڑے بھیا نے غصے میں آ کر میری گڑیا کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ میں نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ آپ نے بھیا کو خوب ڈانٹا اور پھر سب کام چھوڑ چھاڑ کر بازار سے جا کر میرے لیے آنکھیں جھپکنے والی بہت خوبصورت سی گڑیا لے کر آئی تھیں۔ نئی گڑیا پا کر میں اتنی خوش ہوئی تھی کہ میں نے بھیا کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اگر وہ میری پرانی گڑیا کی ٹانگ نہ توڑتے تو مجھے ایسی حسین گڑیا کبھی نہ ملتی۔''

ذکیہ بیگم کے چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ بکھر گئی۔

طاہرہ کہنے لگی۔

''امی! آپ کو یاد ہے کہ عید کے موقع پر آپ نے فیروزی رنگ کا کپڑا ماسی درزن کو دیا تھا کہ وہ میرے لیے فراک سی دے۔ وہ بیمار ہوگئی اور عید سے ایک دن پہلے آپ نے وہ کپڑا واپس منگوا کر رات بھر جاگ کر میرے لیے فراک سیا تھا اور اس پر جا بجا گوٹے کے پھول بنا کر ٹانک دیئے تھے۔ عید والے دن جب میں نے وہ فراک پہنا تو وہ میری سب سہیلیوں کے کپڑوں سے کہیں زیادہ دیدہ زیب تھا۔ سب نے اس کی بہت تعریف کی تھی اور آپ کی ہنرمندی کا خوب چرچا ہوا تھا۔''

طاہرہ کی بات سن کر ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اُن کی نظروں کے سامنے وہ ننھی منی سی طاہرہ فیروزی فراک پہنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

ذکیہ بیگم کا چہرہ دیکھ کر طاہرہ کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔ وہ کہنے لگی۔

''اورامی! یاد ہے جب میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں کے ساتھ پاس کیا تھا تو آپ نے میری سہیلیوں کی کیسی شاندار دعوت کی تھی۔ کیسے کیسے مزیدار کھانے بنائے تھے۔ سب انگلیاں چاٹتے رہ گئے تھے۔ خاص طور پر پلاؤ تو ایسا لذیذ تھا کہ کیا کہنے۔ اب آپ ذرا بہتر ہو جائیں تو پھر میں آپ سے بنواؤں گی ویسا ہی پلاؤ۔''

اب ذکیہ بیگم ہنس کر کہنے لگیں۔

''بھئی وقت وقت کی بات ہے۔ اب وہ مولوی مدن کی سی بات کہاں۔''

طاہرہ نے محبت سے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''امی! آج میں نے آپ کو کتنی بھولی بسری باتیں یاد کروائی ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کیوں رو رہی تھیں۔؟''

ذکیہ بیگم کہنے لگیں۔

''بس یونہی کوئی خیال آ گیا تھا۔ ذہن عجیب سی سوچ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔''

طاہرہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''کیا خیال تھا؟ کون سی سوچ تھی؟ کیا وجہ تھی اس سوچ کی؟''

ذکیہ بیگم کہنے لگیں۔

''بھئی خیال اور سوچ کے لیے کوئی پابندی، کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ان کے لیے کوئی سرحد نہیں، کوئی پہرہ نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

طاہرہ نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا! یہی بتا دیں کہ آپ کیا سوچ رہی تھیں؟''

ذکیہ بیگم نے کہا۔

''میں سوچ رہی تھی کہ اگر میری بیماری نے مزید طول پکڑا تو ایسی نوبت نہ آ جائے کہ سب لوگ اکتا جائیں اور اس بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مجھے اولڈ ہوم میں داخل کروا دیں۔''

طاہرہ نے بیقرار ہو کر پوچھا۔

''کیا ہوا؟ ایسا کسی نے کچھ کہا؟''

ذکیہ بیگم نے سکون سے جواب دیا۔

''نہیں بھئی کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس یونہی مجھے خوف محسوس ہوتا ہے کہ کہیں مجھے اجنبی ماحول اور انجان چہروں کے درمیان موت نہ آجائے۔ میرا ارمان ہے کہ جس گھر میں میں نے زندگی کا بیشتر حصہ گزارا ہے، اب اسی گھر میں میری زندگی کی شام ہوجائے اور میری چارپائی اسی گھر سے نکل جائے۔ میں ڈرتی ہوں کہ اگر میں اولڈ ہوم میں مرگئی تو قرب وجوار کے لوگ اور رشتہ دار میرے بچوں کو طعنے دے دے کر شرمسار کرتے رہیں گے۔ میں یہ سوچ کر خوفزدہ ہوجاتی ہوں کہ اگر میری موت وہاں واقع ہوگئی تو کل کلاں کو میرے پوتے پوتیاں جوان ہوکر اپنے باپوں کے سامنے حیرت سے یہ سوال اٹھائیں گے کہ ابو جب ہم سب ایک گھر میں ایک چھت تلے اکٹھے رہ رہے تھے تو پھر آپ نے دادی کو وہاں کیوں جانے دیا؟ آپ کا گھر ہوتے ہوئے ہماری دادی کو خیراتی پناہ گاہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ ہم سب کے ہوتے ہوئے ہماری دادی نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں وہاں کیوں لیں؟ یہاں کیوں نہیں؟ ہم سب کے درمیان کیوں نہیں؟ اور یہ کہ جب ایسی حالت میں ہم آپ سے جدا ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تو پھر آپ نے دادی سے جدا ہونا کیسے گوارا کرلیا؟''

یہ کہتے کہتے ذکیہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ آس پاس سے بے نیاز ہوکر تہہ دل سے اللہ کے حضور فریادکناں ہوگئیں۔

''اے اللہ! میرے بچوں کی زندگی میں کبھی ایسا وقت نہ آئے کہ وہ اپنے بچوں کے سامنے شرمسار اور لاجواب ہوجائیں۔ تو ہمیشہ ان کی لاج اور ان کا بھرم بنائے رکھنا۔''

☆☆☆

عالیہ حمید

چراغ

میرے کلاس روم کی کھڑکی سے باہر کی بڑی سڑک صاف دکھائی دیتی ہے۔ سڑک اونچی اور سکول نیچے کھیتوں کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑی سڑک سے ایک چھوٹی سڑک نکلتی ہے جو سکول کے گیٹ پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ سکول کے کسی بھی کلاس روم میں کھڑے ہو ں تو کھڑکیوں میں سے آتے جاتے لوگ، گاڑیاں او رمویشی وغیرہ صاف دکھائی دیتے ہیں۔

آج بھی میں حسب معمول سبق پڑھانے کے بعد کھڑکی کی طرف جا کھڑی ہوئی۔ کچھ لمحات کے بعد ایک سرخ مہران سکول کی طرف آتی دکھائی دی۔

''کسی کام سے ہیڈ مسٹریس سے ملنا ہوگا۔'' میں نے سوچا اور کلاس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ملازمہ کی آواز آئی۔

''مس! آفس میں آپ سے ملنے کوئی سلیم نامی نوجوان آیا ہے''

''ہائیں؟'' میں نے عینک کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا۔

''کوئی آپ سے ملنے آیا ہے، آفس میں منتظر ہے۔'' ملازمہ نے دوبارہ کہا اور چلی گئی۔

''سلیم!'' ذہن کے گوشے میں کہیں کوئی سلیم نامی نوجوان میرا واقف نہیں تھا۔ ''کون ہوسکتا ہے؟ میں تو کسی سلیم کو نہیں جانتی۔'' میں نے سوچا اور کتاب میز پر رکھ کر باہر آ گئی۔

کوئی پرانا شناسا، کوئی بھانجا، بھتیجا، پرانے ملازم .....ان میں سے میری ۴۵ سالہ زندگی میں سلیم نام کا کوئی شخص نہیں تھا۔

اسی اثنا میں دروازے پر پہنچ گئی۔ آفس کے اندر جاتے ہوئے حجاب سا محسوس ہوا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اندر دیکھا، ایک باوقار سنجیدہ سا نوجوان بیٹھا تھا۔ کچھ توقف کے بعد گلا کھنکھارتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

''السلام علیکم'' اس نے بڑے ادب کے ساتھ سلام کیا تھا۔

''جی وعلیکم السلام'' میں نے دھیمے سے جواب

دیا۔

''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں'' اس نے شاید میرے چہرے پر ناشناسائی دیکھ لی تھی۔

''بہت معذرت.....میں واقعی پہچان نہیں پائی۔'' میں نے مارے تجسس کے کہا۔

''بیس سال پہلے کے سلیم عرف چھنو کو کیسے پہچان پائیں گی۔ وہ سلیم جس کو خودداری کا درس دیتے ہوئے آپ نے اس کا نام تک نہیں پوچھا تھا'' اس نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔

اب میری آنکھیں ساکت تھیں اور ذہن سلیم نام کے نوجوان کو ماضی میں لے جا کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''گھبرائیں نہیں میں تو صرف آپ کی امانت لوٹانے آیا ہوں۔ یہ رکھ لیجیے۔'' سلیم نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ سامنے میز پر رکھ دیے۔

اور مجھے ایک جھماکے کے ساتھ وہ سب یاد آ گیا جو بیس سال کی مسافت پر کہیں پیچھے رہ گیا تھا!

☆☆☆

نہر کے اس پار، پھاٹک کے آس پاس، نیچے کھیتوں کی طرف ہر جگہ دیکھا مگر وہ نہیں ملا۔ میری نگاہیں تیزی سے گھوم رہی تھیں ادھر سے ادھر، اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ کہیں اس کی جھلک دکھائی دے جائے۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور صاحب گاڑی چلا دیں۔

جب تک ریل پھاٹک سے گزر نہ جاتی میں بڑی تسلی کے ساتھ اسے ڈھونڈتی۔ نہر کے اس پار بھی گیارہ سالہ بچے کے سراپے میں اسے تلاش کرتی تھی لیکن ناکام۔ پھر ریل کی آواز دور سے سنائی دیتی تو میں اسے نہر کے اس پار تلاش کرتی کہ کہیں گاڑی کے آس پاس نہ ہو۔ لیکن نہیں، پھر ریل تیزی کے ساتھ ہلکے سکیل کا زلزلہ سا پیدا کرتی نظروں سے گزر جاتی۔ گاڑیاں رینگنے لگتیں۔ پھاٹک کھل جاتا تو میں دائیں طرف کے کھیتوں پر نگاہ ڈال لیتی۔ وہ وہاں بھی نہ ہوتا اور ڈرائیور صاحب گاڑی آگے بڑھا دیتے۔ لائن کراس کر کے ریڑھی بانوں، کھوکھوں کے آس پاس۔ پھر وہ کہیں نہ ملا مجھے۔ جب کافی تلاش کے بعد میری گاڑی جی ٹی روڈ پر آ جاتی تو میں اپنے ہاتھ میں پکڑا دس کا نوٹ دوبارہ پرس میں ڈال لیتی۔

تین ماہ سے یہ میرا روز کا معمول تھا۔ ہاتھ میں دس کا نوٹ پکڑے اس سانولے سے بچے کو تلاش کرنا جو

تین ماہ پہلے ایک چھابڑی میں بھٹے سجا کر میری کار کی کھڑکی کے پاس لایا تھا۔اس کی میلی کچیلی چھابڑی میں جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنا رنگ و روپ کھو چکی تھی تین عدد بھٹے اور کچھ مڑے تڑے نوٹ رکھے تھے۔

''باجی بھٹہ!'' اس نے چھابڑی کھڑکی میں سے آگے کر کے کہا۔

پھاٹک کھل رہے تھے۔گاڑی رش کی وجہ سے ابھی رکی ہوئی تھی۔میں نے اس کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''لے لو باجی!'' اس نے اصرار کیا۔

''نہیں بھئی'' میں نے ذرا سا ڈانٹا ساتھ ہی ڈرائیور صاحب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''باجی پلیز لے لو۔'' اس نے پھر اصرار کیا۔

''ضرورت نہیں ہے بھئی۔'' میں نے کار کی کھڑکی سے اس کی چھابڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

''باجی مجھے تو ضرورت ہے ناں۔آپ کی مہربانی ہوگی۔میرے پاس سو روپے ہو جائیں گے۔'' اس نے التجا کی تھی۔

''کیوں کسی سے ریس لگا رکھی ہے کیا؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''میں نے اماں کو جا کر دینے ہیں جی'' وہ گاڑی کی رفتار آہستہ ہونے کی وجہ سے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''اماں کو یہی دے دو۔کافی ہیں۔خوامخواہ رقم بٹورنے کا بہانہ کرتے رہتے ہو تم لوگ!'' میں نے اسے پھر ڈانٹا۔

''ابا کی دوائی لینی ہے جو سو کی آتی ہے۔خدا رسول کی قسم باجی جی!ابا ہفتے سے بیمار ہے۔اسے ہر روز سو روپے کی دوائی لینی ہوتی ہے مگر میرے پاس ہر روز پیسے کم ہوتے ہیں۔آج ایک ہفتہ ہو گیا ہے جی۔'' اس نے گاڑی کی رفتار بڑھنے کے ساتھ قدم بھی تیز کر لیے۔

ایک لمحے کو مجھے اپنی غیر سنجیدگی پر غصہ آیا۔میں نے جلدی سے پرس کھولا۔ڈرائیور صاحب نے کار کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

لیکن یہ کیا؟ پرس تو خالی تھا۔میں نے مارے شرم کے دو چار بار ہاتھ اندر ڈالا، پرس ٹٹولا،لڑکا میرے پرس پر نگاہیں رکھ کر تیز قدم چل رہا تھا۔

اب وہ دوڑ رہا تھا اور پیسے میرے پاس نہیں تھے۔میں اسے کہہ بھی نہ سکی۔میری شدید خواہش تھی کہ کار کی

رفتار بڑھ جائے اور وہ پیچھے رہ جائے۔ پھر کچھ لمحوں بعد ایسا ہی ہوا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر کار کے بیک ویو مرر میں دیکھا وہ پیچھے آتا ہوا بلکہ دوڑتا ہوا نظر آ رہا تھا..... اس کے پس منظر میں نہر تھی اور نہر کے پار کچی بستی۔ غالباً وہیں اس کی ماں سو روپے کا انتظار کر رہی ہوگی۔

میری کار کی پشت کو گھورتے گھورتے اس کی رفتار کم ہوگئی۔ ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہو کیونکہ جس کا باپ گھر میں ہفتہ بھر سے دوائی کا منتظر ہو اس کی رفتار کم نہیں ہو سکتی۔ یقیناً ڈرائیور صاحب نے کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ ریلیٹو موشن (Relative Motion) اسی کو کہتے ہیں کہ جب آپ کی رفتار بڑھتی ہے تو دوسرے کی کم ہوتی دکھائی دیتی ہے! حالانکہ وہ تو اپنی رفتار سے آ رہا ہوتا ہے۔

ایک افسوس دل میں پیوست ہوگیا۔ گاڑی جی ٹی روڈ پر چڑھ گئی۔ میں نے بائیں طرف دیکھا۔ دور کہیں وہ چھابڑی ہاتھ میں پکڑے کسی اور کار کی کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔

''یا اللہ اس کو وہاں سے دس روپے مل جائیں!'' میں نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی۔ پھر سفر بہت خراب گزرا۔ دھیان بار بار اس معصوم لڑکے کی طرف چلا جاتا۔

''کتنی لذت ہے اس خوشی کو خریدنے میں جو دس روپے میں ملنے والی تھی۔'' میں نے سوچا۔

''لیکن میرے پرس کو بھی آج ہی خالی ہونا تھا۔'' میں افسردہ تھی۔

''وہ غریب کیا سوچے گا کہ کار میں اتنی ٹھاٹھ کے ساتھ جانے والی باجی کے پاس دس روپے بھی نہ تھے۔'' میں نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے۔

''ڈرائیور صاحب آپ کے پاس دس روپے تھے؟'' میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''نہیں بیٹا! اگر ہوتے تو میں ہی دے دیتا۔ اتفاق سے آج میری جیب بھی خالی تھی۔'' انھوں نے تحمل سے جواب دیا۔

''اتنی بھی فکرمندی والی بات نہیں ہے۔ سہ پہر تک نہیں تو شام تک اس کے بھٹے بک جائیں گے اور وہ سو روپیہ گھر لے جا سکے گا۔'' انھوں نے پھر کہا۔

''ہفتہ بھر سے تو بک نہیں رہے تھے اب کیا بکیں گے؟'' میں نے دل گرفتگی کے ساتھ کہا۔

کبھی میں اپنے پرس کو غصے کے عالم میں دیکھتی اور کبھی باہر نگاہ کر کے سوچ میں کھو جاتی۔ کہاں اس میں

ہر روز ہزار، پانچ سو پڑے رہتے تھے اور کہاں یہ وقت کہ دس کا نوٹ نہ ملا ضرورت پڑنے پر۔

''کیوں نہ دس روپے میں اسے صبح دے دوں۔ آخر ہر روز وہاں سے گزرنا میرا معمول ہے۔'' میں نے سوچا اور مطمئن ہوگئی۔

اگلی صبح میں نے دس دس کے کئی نوٹ پرس میں رکھ لیے اور ڈرائیور صاحب سے پھاٹک پر گاڑی کی رفتار آہستہ رکھنے کا کہہ دیا۔ ہم پھاٹک پر پہنچے ضرور مگر وہ وہاں نہیں تھا اور نہ ہی اگلے کئی روز وہ ملا۔ حتیٰ کہ تین ماہ گزر گئے۔

آج سے کوئی بیس سال قبل سائنس ایجوکیٹر کے طور پر تحصیل سرائے عالمگیر کے ایک گاؤں بھاگ نگر میں میری تقرری ہوئی یہ فاصلہ لوکل ٹرانسپورٹ پر طے کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے گھر والوں نے ایک گاڑی اور ڈرائیور کا انتظام کر دیا۔ یہ علاقہ نہر کے ساتھ ساتھ ہے۔ کپڑے دھوتی عورتیں، سکول جاتے بچے، کشتیوں پر نہر پار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف نہر تو دوسری طرف سرسبز و شاداب کھیت ہیں۔ کچھ آگے پاک آرمی کی کشتیوں کی چوکی ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انھیں سلامی پیش کر کے آگے بڑھ جائیں تو بھاگ نگر کا پل دور سے دکھائی دیتا ہے۔ انھیں راہوں پر سفر کرتے سکول سے واپسی پر وہ بھٹہ فروش لڑکا دکھائی دیا تھا جس کو میں دس روپے نہ دے سکی تھی۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ ہم پھاٹک کے قریب گاڑی کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے کہ کار کی کھڑکی سے ایک سانولا سا ہاتھ آگے بڑھا۔ میں اس اچانک افتاد پر جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔

''اللہ کے نام پر!'' آواز آئی تھی۔

''مانگنے والا ..... نالائق!'' یہ کہہ کر میں نے باہر دیکھا۔ مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا، سامنے وہی بھٹہ فروش لڑکا کھڑا تھا۔

''تم؟ تمھاری چھابڑی کہاں ہے؟'' میں نے بے ساختہ کہا۔

وہ کچھ لمحے حیرت سے مجھے تکتا رہ گیا۔

''دیکھو ..... تمھارے سو روپے پورے کرنے کو میں نے تین ماہ انتظار کیا۔'' میں نے لہجے پر قابو پا کر کہا۔

''باجی! میں اب بھٹہ نہیں فروخت کرتا۔ چھابڑی تو ادھر بہہ گئی۔'' اس نے انگلی سے نہر کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے وضاحت مانگی۔

''اب میں مانگتا ہوں اس میں فائدہ ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا پیالہ آگے کر دیا۔

''تم نے محنت چھوڑ دی اور یہ گھٹیا کام شروع کر دیا۔'' میں نے اسے سخت لہجے میں کہا۔

''جب میں محنت کرتا تھا، بھٹے بیچتا تھا تب میرے بھٹے کوئی خریدتا نہیں تھا۔ سب گندے جراثیم والے، گرد والے بھٹے کہہ کر دھتکار دیتے تھے۔ اب مانگتا ہوں تو کہتے ہیں کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔'' اس نے کہا اور کچھ لمحے کو خاموش ہو گیا۔

میں اس کے بے ساختہ جواب پر حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ میں نے چپکے سے دس کا نوٹ اس کے کشکول میں ڈال دیا تھا۔ بعد میں بہت دیر طبیعت عجیب سی رہی۔ اس نے مجھے مزید پریشان ہونے کو ایک اور سوال تھما دیا تھا کہ کہیں میں نے ہی اسے بھٹہ فروش سے فقیر تو نہیں بنا دیا؟

اگر میں اسے دس روپے دے دیتی تو شاید وہ آج فقیر نہ بنتا۔ یہ وہ احساس تھا جو اس احساس سے بھی زیادہ کربناک تھا جو تین ماہ سے مجھے ستا رہا تھا۔

''باجی! اللہ کے نام پر دے دو'' کچھ دن بعد وہ پھر مانگتا ہوا دکھائی دیا۔

''دیکھو تم مانگنا چھوڑ دو۔ یہ کوئی عمر ہے تمھاری؟'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''مانگوں نہ تو اور کیا کروں؟'' اس نے کچھ لمحوں کے بعد کہا۔

''پڑھو! پھر کاروبار کرنا'' میں نے پروگرام پیش کر دیا جو اس نے فوراً مسترد کر دیا۔

''کیسے پڑھوں؟ ادھر ابا بیمار ہے۔'' اس نے نہر کی طرف اشارہ کیا۔

''اور پھر پیسہ کہاں سے آئے گا؟'' اس نے میرے جواب سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''ارادہ کرو تو وسائل پیدا ہو جائیں گے۔'' میں نے امید دلائی۔

''یہ امیروں کے کام ہیں۔ جاتا تو میں بھی تھا۔ تین کلاسیں پڑھی ہیں۔ ان کشتیوں پر! اب گھر کی مجبوریاں ہیں۔ مجھ سے چھوٹے کو بھی ابے نے اٹھا لیا ہے۔''

''چلو اگر پڑھنا نہیں تو نہ پڑھو۔ مگر یہ مانگنے کا کام اچھا نہیں۔ چھابڑی ہی لگا لو۔ محنت کی کمائی مانگنے سے

اچھی ہوتی ہے۔'' میں نے پھر سمجھایا بلکہ التجا کی تھی۔

''پہلے یہی تو کرتا تھا جی۔'' اس نے جواب دیا۔''پھر اس بابو نے میرا کاروبار تباہ کر دیا جی۔'' وہ افسردہ سے لہجے میں بولا۔

''کس بابو نے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کوئی تھا۔آپ کی طرح کار میں گزرا تھا یہاں سے۔اس دن بھیڑ زیادہ تھی۔وہ نہر کنارے کار کھڑی کیے تھا۔میں اس کے قریب گیا، بھٹہ خریدنے کی التجا کی لیکن اس نے منع کر دیا۔'' وہ کچھ ثانیے خاموش رہا۔

''اس دن ابا بہت بیمار تھا۔دوائی تین ہفتوں سے نہیں ملی تھی۔ پیسے ہی اکٹھے نہیں ہوتے تھے۔ اماں میرے گھر داخل ہوتے ہی امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتی اور میں چھابڑی اس کے سامنے خاموشی سے رکھ دیتا۔وہ گنتی تھی، بار بار گنتی تھی ساٹھ یا ستر روپے سے زائد نہ ہوتے۔وہ پوچھتی، ڈانٹتی، محنت نہ کرنے کا طعنہ دیتی۔ جواب میں میں تو خاموش رہتا لیکن ابے کے کراہنے کی آواز بلند ہو جاتی تھی۔''

''لیکن اس بابو نے کیا کر دیا تھا؟'' وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''اس دن میں نے سوچا تھا کہ دوائی کے پیسے ضرور پورے کروں گا۔اس دن بڑی بے عزتی کروائی تھی۔گالیاں کھائیں، کوئی بے شرم کہتا، کوئی ڈھیٹ۔ بابو نہر کنارے ریل کے گزرنے کا منتظر تھا میں نے چھابڑی آگے کی اس نے پرے دھکیل کر شیشہ چڑھا لیا۔میں بند شیشے کو ہی بجاتا تھا۔انگلی سے کھٹ کھٹ کرتا تھا۔اس نے تنگ آ کر شیشہ نیچے کیا اور میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر زوردار دھکا دیا۔''

''حرامی مڑتا نہیں۔'' گرتے ہوئے میرے کانوں میں اس کی آواز آئی تھی۔میری چھابڑی بھٹوں سمیت لڑھک کر نہر میں جا گری۔میرا کاروبار تباہ کر دیا جی اس نے۔ پورے سات بھٹے ۳۰ روپے اور چھابڑی! میں نے کپڑے جھاڑ کر بابو کی طرف دیکھا وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ کار بڑھا کر آگے چلا گیا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور نہر کے پار دیکھنے لگا۔

اتنی دیر میں ریل آ گئی اور ہلکا سا زلزلہ پیدا کر کے گزر گئی۔لیکن ریل کی پٹڑیوں پر سے گزرنے والا زلزلہ میرے دل سے گزر رہا تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ایک چھابڑی بھی ایک کاروبار ہوا کرتی ہے وہ گھر کا چولہا جلاتی ہے تو کاروبار ہی ہوئی ناں!

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے دھیمی آواز میں

پوچھا۔

''میں خالی ہاتھ گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ابے کی آہیں تو آسمان کو چھو لیتیں اگر اسے چھابڑی کے بہہ جانے کا علم ہوتا۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کے فاقے۔ جس دن کھانے کو کچھ نہ ہوتا وہ بھٹے کھا کر ہی گزارہ کر لیتے تھے۔ میں نے سوچا نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں۔''

ڈرائیور صاحب کار بڑھانا چاہتے تھے میں نے کہہ کر روک لیا۔

''پھر؟'' میں آنکھیں بغیر جھپکائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پھر میں نے سوچا کہ میری بے روزگاری کے بغیر بھی وہ جی ہی لیں گے چاہے مشکل سے ہی جئیں لیکن میری پانی میں پھولی ہوئی نعش دیکھ کر وہ کیسے جی پائیں گے..... یہ سوچ کر میں نے خاک اٹھائی اور سر پر ڈال لی، کچھ منہ پر مل لی، کچھ کپڑوں پر ڈال لی۔ بال بکھیر لیے، انگلی ڈال کر قمیص کے دامن میں سوراخ کر ڈالا اور پھر اسے چیر دیا۔ گھسے ہوئے کپڑوں میں سوراخ کرنا کوئی مشکل تو نہیں ہوتا ناں!'' وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

غریب اپنے اوپر طنز کر رہا تھا۔ میں بے بسی سے دیکھتی رہی۔

''پھر ایک کار آئی..... میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ ابا بیمار ہے جی ..... چھوٹے بہن بھائی بھوکے ہیں، اللہ کے نام پر دے دو بھائی جی!'' میں نے لرزتے ہوئے صدا لگائی۔ ماتھا پسینے میں بھیگ گیا۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔

''دے دیں ناں اسے دس بیس روپے، بے چارہ معصوم ہے۔'' کار کے اندر سے آواز آئی۔

کار والے نے بیس کا نوٹ میری ہتھیلی پر رکھا اور آگے بڑھ گیا۔ میں حیران رہ گیا۔ پسینہ آنے کا احساس ختم ہو گیا۔ آنکھوں میں ندامت کی بجائے چمک آ گئی تھی۔ میں نے اگلی گاڑی کے آگے ہاتھ بڑھا کر یہی سوال کیا۔

''اسے چالیس پچاس روپے زکوٰۃ کے پیسوں سے دے دیں کتنا چھوٹا سا ہے۔''

پھر ایک نسوانی آواز ابھری اور اپنی ہتھیلی پر پچاس کا نوٹ دیکھ کر میری تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ شام تک یہی ہوتا رہا۔ اتنی رقم کہ سنبھالی نہ گئی۔'' اس کی بات ختم ہوئی اور میری آنکھوں میں نمی ابھرنے لگی۔

''اس دن میری ماں نے آٹا گوندھ کر روٹی بنائی تھی۔ میں نے اپنے بہن بھائیوں کے لیے جلیبیاں خریدی تھیں۔ وہ بہت خوش تھے جی۔'' اس نے بات ختم کی۔

''تمھاری ماں کو پتہ ہے تم مانگتے ہو؟'' میں نے نمی چھپاتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی! پتہ ہے۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''انھوں نے تمھیں منع نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا تھا جی..... میں نے تنگ آ کر کہا کہ میں نہر میں چھلانگ لگا دوں گا۔ پھر ابے کی کراہیں اور بلند ہو جائیں گی اور تو آٹا نہ گوندھ سکے گی۔ اس کے بعد اس کو چپ لگ گئی ہے جی۔ بالکل روک ٹوک نہیں کرتی۔''

جواباً میں نے دس روپے اس کے کشکول میں ڈالے اور کار آگے بڑھالی۔

کچھ دنوں بعد گرمیوں کی تعطیلات ہو گئیں اور میں کچھ عرصہ کے لیے گھر چلی گئی یوں ان راستوں اور اس بھٹے والے سے میرا رابطہ ختم ہو گیا..... اگرچہ رابطہ ختم تھا مگر میں پریشان تھی۔ نہ جانے ہم کیوں ان ریڑھی بانوں اور خوانچہ فروشوں سے کچھ نہ کچھ خرید نہیں لیتے؟ کوئی دس روپے کا کھلونا، کوئی پلاسٹک کا بال، کوئی گڑیا، پانی کی پستول، یا رنگ اڑی ہوئی چھابڑی والے کا بھٹہ! تاکہ وہ فقیر بننے سے بچ جائے۔

اس دوران یہی سوچ میرے اوپر حاوی تھی کہ اسے فقیر بنانے میں میرا بھی کردار ہے اور مجھے ہر صورت اسے واپس محنت کے راستے پر لانا ہے۔ اس میں گھر والوں اور دوستوں کو بھی شامل کر لیا۔ لیکن کوئی سنجیدہ نہیں تھا۔ میں ان سے مشورے کر کر کے تھک چکی تھی۔ اب وہ بھی مجھے مفت مشورے دے دے کر تھک چکے تھے سوالٹے جواب آنا شروع ہو گئے۔ پھر ہوا یوں کہ ابو جی نے مجھے ایک بہت اچھا مشورہ دیا جو سن کر میں بہت مطمئن ہو گئی اور چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ خدا خدا کر کے سکول دوبارہ کھلا۔ پھر وہی روز کا آنا جانا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دوبارہ دکھائی دیا۔

''سلام باجی! اللہ کے نام پر دے دو!'' اس کا کشکول آگے بڑھا۔

''وعلیکم السلام، کیسے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی خیریت سے ہوں۔'' مختصر جواب آیا۔

''ان تین ماہ میں تم ماہر فقیر بن چکے ہو۔'' میں نے سکوں سے بھرے کشکول کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کاروبار اچھا ہے باجی جی!'' اس نے مسکراتے ہوئے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔

''اسے کاروبار نہ کہو۔ سنا تم نے؟'' میں نے ذرا خفگی کے ساتھ کہا تھا۔

''تو کیا کہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''فقیری! بھکاری ہو تم۔ پتہ ہے لوگ تمھیں ایک گھٹیا اور گندہ فقیر کہتے ہیں، ہاتھ پھیلانے والا۔'' میں نے اسے غصہ دلانے کی کوشش کی۔

''باجی! تم لوگوں کا باپ ادھر گھر میں بیمار نہیں ہے۔ تمھاری ماں لوگوں کے گھروں میں کام نہیں کرتی اور نہ ہی ان کی گالیاں کھاتی ہے۔ تمھارے چھوٹے بہن بھائی بھوکے نہیں سوتے۔ اس لیے فقیری تم کو بری لگتی ہے۔ مگر مجھے تو یہ بہت اچھی لگتی ہے۔ کاروبار کی طرح۔'' اس کے الفاظ بتا رہے تھے کہ وہ وقت سے پہلے سیانا ہو گیا ہے۔

''اللہ کے نام پر دے دو باجی!'' میری چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

''یہ لو'' میں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹوں کی گٹھیاں اس کے کشکول میں ڈال دیں۔

''یہ کیا ہے؟'' اچانک اتنی رقم دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''بیس ہزار!'' میں نے کہا۔

''یہ کیا باجی جی؟ اپنی پوری تنخواہ مجھے دے دی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں میرے زیور کی زکوٰۃ ہے۔'' میں نے واضح کیا۔

''لیکن ساری مجھے دے دی باجی ..... یہ واپس لے لو۔ اتنی رقم چھپانے کے لیے ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ بس کوئی پانچ کا سکہ یا دس کا نوٹ دے دو۔''

''ایک بار صرف ایک بار ایک ریڑھی خرید کر بھٹوں والا کاروبار دوبارہ شروع کر دو۔ اپنے لیے نہ سہی، اپنے گھر والوں کے لیے نہ سہی۔ میرے ضمیر کی خاطر جو مجھے ہر وقت ٹھوکے دیتا رہتا ہے کہ تم نے اس بارہ برس کے بچے کا کاروبار تباہ کر دیا۔''

''دیکھو میری بات سنو'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے انگلی کے اشارے سے روک دیا۔

''الکاسب حبیب اللہ ..... جو محنت کرتا ہے ناں اللہ کا دوست بن جاتا ہے۔ تم اس راہ پر چلو تو سہی۔ خدا تمھاری مدد ضرور کرے گا کیونکہ دوستوں کو تنہا چھوڑنا

اس کی سنت نہیں۔''میں نے ڈرائیور صاحب سے گاڑی چلانے کا کہا۔ میں اس کا جواب سننا نہیں چاہتی تھی۔اس بار میں نے بیک ویو مرر میں بھی نہیں دیکھا کہ کہیں وہ میرے پیچھے بھاگتا ہوا نہ آ جائے اور رقم گاڑی میں پھینک کر واپس نہ ہو جائے۔

اگلے دن بھی وہ دکھائی نہیں دیا اور پھر تین ماہ گزر گئے وہ مجھے کبھی دکھائی نہیں دیا۔ میرا سکول دور تھا میں ٹرانسفر ہو کر قریبی علاقے میں آ گئی اور بھاگ نگر، نہر اور اس کے پار کھیتوں سے میرا رابطہ کٹ گیا۔

☆☆☆

''اوہ .....تو تم وہی بھٹہ فروش ہو'' میں حیران کھڑی اسے دیکھ رہی تھی کیونکہ اب تو وہ ایک سنجیدہ سا باوقار نوجوان بن چکا تھا۔

''مجھے پتہ تھا کہ آپ مجھے نہیں پہچان پائیں گی۔ اتنی بڑی رقم دے کر نام تک نہ پوچھا آپ نے!'' اس نے بڑے ادب سے کہا۔

''یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا یا شاید ہمارا قصور ہے کہ ہم بھٹہ فروش، چھابڑی والا، کھوکھے والا، پان والا وغیرہ نام رکھ دیتے ہیں اور اصل نام پیچھے چلا جاتا ہے۔ میں بھی تمھیں بھٹہ فروش کہتی رہتی تھی۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بس آپ کو آپ کی امانت لوٹانے آیا تھا۔'' اس نے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمھاری ضرورت پوری ہو چکی ہے؟ کیا تم نے مانگنا چھوڑ دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بیس ہزار میں ریڑھی خریدی اور الکاسب حبیب اللہ کا اصول ساتھ رکھا۔اور دیکھ سکتی ہیں کہ کار پر آیا ہوں۔'' اس نے باہر اشارہ کیا۔

''ماشاءاللہ!'' میں خوشی کے عالم میں یہی کہہ سکی۔

''بنا نام پوچھے بنا جانے آپ نے بیس ہزار کشکول میں ڈال دیے۔ اتنا اعتبار.....سوچا اب کچھ کر کے ہی دکھاؤں، اس اعتبار کو معتبر کر دوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''پڑھا بھی تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''خود نہیں پڑھا مگر چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھایا ..... وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے ہیں سب۔ بہت مطمئن ہیں زندگی سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کار انھوں نے خرید کر دی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، بھٹے والی ریڑھی سے خریدی۔'' اس نے جواب دیا۔

''بھٹے والی ریڑھی سے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''بھٹوں کے ساتھ ساتھ سبزی بھی بیچ لیتا تھا۔ گھر کی سبزی بھی بچ جاتی اور روز کے دوسو روپے۔ اس میں فائدہ لگا تو پھل بھی لگا لیے۔ گھر والے پھل بھی کھانے لگے۔ پھر بہت کچھ بیچا جی اس ریڑھی پر۔ بچوں کے کھلونے، چنا چاٹ، غبارے، لمبی تفصیل ہے جی۔ پھر دوکان کرایہ پر لے لی اور اس میں سبزی بیچنے لگا۔ پھر جنرل اسٹور بنالیا۔ اب شہر میں میری دکانیں کرایہ پر ہیں جی.....اللہ کا بہت کرم ہے۔'' وہ بتا کر خوش ہوگیا۔

''تم نے نہر کنارے کی بستی چھوڑ دی ہوگی۔'' میں نے پوچھا۔

''میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر بہن بھائی اصرار کر کے لے گئے۔ شہر کی طرف گھر ہے۔ سب باپ کا درجہ دیتے ہیں۔ اماں ابا اب دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن انھوں نے میری خوشیوں کے دن دیکھے ہیں۔'' اس نے کہا اور اداس ہوگیا۔

''اور سناؤ ادھر کے حالات کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کچھ عرصہ کشتی میں سکول گیا تھا۔ اب اپنے بیٹے کو چھوڑنے جاتا ہوں کار میں تو.....تو.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''تو کیا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''کار کی کھڑکی سے چھابڑی والے واقعی بڑے حقیر دکھائی دیتے ہیں!''

پتہ نہیں اس نے طنز کیا تھا یا اپنے احساسات بتائے تھے، میں شرمندہ ہوگئی۔

''لیکن اپنی حیثیت کبھی بھولتا نہیں۔ دس کا نوٹ اوپر والی جیب میں رکھنے کی عادت ہے جی۔'' اس نے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

''مجھے کیسے ڈھونڈا؟'' یکا یک میرے ذہن میں آیا۔

بھاگ نگر والے اسکول سے آپ کی گاڑی کا رنگ بتا کر آپ کا نام پتہ لیا تھا۔ پھر جس جس سکول میں آپ کی ٹرانسفر ہوئی وہاں سے اگلے سکول کا پتہ لے لیتا۔ اس طرح یہاں تک پہنچا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

پھر اس نے بہت باتیں یاد کروائیں، سنائیں۔ غم کے افسانے، خوشی کی کہانی، چائے کے دوران یہ سب قصے تمام ہوئے اور وہ جانے کو اٹھا تو میں نے اسے رقم

واپس لے جانے کو کہا۔

''نہیں یہ تو قرض تھا واپس کرنے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اور اب میں خود بھی زکوٰۃ دیتا ہوں اور کئی چھابڑی والوں کو اس راہ پر لگا چکا ہوں اور اس بیس ہزار سے اگر آپ ایک اور فقیر کو خودداری کی راہ پر لگا سکیں تو خوشی ہوگی۔ چراغ سے چراغ جب جلایا ہے تو روکیے نہیں۔'' اس نے کہا اور فی امان اللہ کہہ کر رخصت چاہی۔

''فی امان اللہ۔'' میں نے کہا۔

''خدا کرے چراغ جلتا رہے'' میں نے زیرلب دعا کی اور کلاس روم کی طرف چل دی۔

☆☆☆

طوبیٰ احسن

دلِ نادان

ثانیہ جب سے مینا کے گھر سے آئی تھی چپ چپ تھی۔سوچوں میں مگن،فکر میں غلطاں،کھوئی کھوئی سی، رات ہوگئی،لیکن اس کی چپ نہ ٹوٹی۔شاہد کام سے واپس آیا تو یہی دیکھ رہا تھا کہ ثانیہ خاموش خاموش ہے۔

''کیا بات ہے؟ آج بیگم صاحبہ کے ماتھے پر شکنیں کیوں ہیں؟''اس نے بیوی کو چھیڑا۔

''چپ رہیے مجھ سے مت بولیے۔''خلافِ توقع ثانیہ پھٹ پڑی۔

''کیوں بھئی؟''شاہد نے نرم لہجے میں سوال کیا''کیا مسئلہ ہے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں۔''ثانیہ نے رکھائی سے جواب دیا۔

وہ چپ رہا اس کو اندازہ تھا کہ ثانیہ کے پیٹ میں کوئی بات مشکل ہی سے ٹکتی ہے،خود ہی بول پڑے گی۔ اور وہی ہوا بچوں کے سونے کے بعد ثانیہ خود ہی شاہد سے مخاطب ہوئی۔

''آپ کو تو پتہ ہے آج مینا نے چائے پر بلایا تھا۔ وہ اسلام آباد سے ابھی لاہور شفٹ ہوئی ہے۔''

''ہاں بھئی معلوم ہے۔''انہوں نے سر ہلایا۔''پھر کیا ہوا کیا مزہ نہیں آیا پارٹی میں؟''

''نہیں مزہ تو بہت آیا، ساری پرانی دوستیں جمع تھیں۔''

''پھر؟''شاہد نے سوالیہ نظروں سے ثانیہ کی طرف دیکھا۔

''آپ کو تو پتہ ہے میں اور مینا ایک ساتھ اسکول گئے۔کالج میں داخلہ بھی ایک ساتھ ہی لیا۔ ہماری شادی بھی آگے پیچھے چھ ماہ کے وقفے سے ہوئی۔ ہر میدان میں میرا اور مینا کا مقابلہ رہتا تھا۔اور ہمیشہ میں ہی اس سے آگے بڑھ جاتی۔اگر وہ سیکنڈ آتی تو میں فرسٹ کبھی وہ مجھ سے جیت نہ سکی۔ مالی طور پر مستحکم تھے۔لیکن آج مینا نے مجھے مات دے دی۔'' ثانیہ کی آواز بھرا گئی۔

''کیا مطلب؟''شاہد نے حیران ہو کر

پوچھا۔''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''آپ نے مینا کا گھر دیکھا ہے؟'' ثانیہ نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔''اتنا بڑا بنگلہ لیا ہے اور اس کو اتنی خوبصورتی سے سجایا ہے کہ بس..... پردے، کارپٹ، حتیٰ کہ دیواروں پر رنگ وروغن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بچوں کے کمرے بے حد خوبصورتی سے سیٹ کیے ہیں۔ باتھ روم کے ٹائلز ہوں یا فرنیچر غرض یہ کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس میں کوئی نقص نکالا جا سکے پھر کلر اسکیم کا انتخاب اس قدر اعلیٰ کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔'' ثانیہ تیز تیز لہجے میں بولتی چلی گئی۔

''مجھ کو سوچنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' شاہد نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا''تم تو کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی ہو مینا کے گھر سے۔''

''آپ دیکھ لیتے تو آپ کا بھی یہی حال ہوتا۔'' ثانیہ نے پرزور انداز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اللہ نہ کرے جو مجھ کو کبھی دیکھنا پڑے آپ کی سہیلی کا گھر۔'' شاہد نے شرارت سے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔''خواہ مخواہ میں بھی تمہاری طرح احساس کمتری کا شکار ہو گیا تو مارا جاؤ نگا۔''

ثانیہ نے شاہد کی بات پر کوئی توجہ نہ دی''مجھ کو بھی ایسا ہی گھر چاہیئے۔'' ثانیہ نے ضدی لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' شاہد نے ثانیہ کی طرف نگاہیں گاڑ کر دیکھا۔ وہ حیران تھا۔ بات مذاق کی حد سے باہر نکل گئی تھی۔

''مجھ کو بھی مینا جیسا گھر چاہیے۔ اگر ہم گھر تبدیل نہیں کر سکتے تو بھی گھر کے اندر سب کچھ میں بدلنا چاہتی ہوں۔'' ثانیہ نے حتمی انداز میں کہا۔

''جب سے میں مینا کے گھر سے آئی ہوں مجھ کو اپنے فرنیچر اور قالین سے گھن آرہی ہے۔ در و دیوار سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ اور یہ پردے؟'' ثانیہ نے طنزیہ لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔''آپ کو تو علم بھی نہ ہوگا کہ آج کل کس قسم کے پردے لگ رہے ہیں۔ میں تو اپنی سہیلیوں کو اپنے گھر چائے پر بھی نہیں بلا سکتی۔ میں ساری چیزیں تبدیل کراؤ نگی۔''

''اچھا بھئی کرالینا۔'' شاہد نے معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔''ابھی سو جاؤ شیخ چلی کی خالہ، صبح سویرے اٹھنا ہے۔''

''کیا؟'' ثانیہ کو کرنٹ لگا۔''میں سچ کہہ رہی ہوں

میں مینا سے اس معاملے میں شکست کھانا گوارا نہیں کرسکتی۔''

''تم جو جی چاہے کرو۔'' شاہد نے بیزاری سے کمبل میں منہ چھپالیا۔

رات کو ثانیہ خواب میں بھی یہی دیکھتی رہی کہ وہ مینا سے بھی زیادہ خوبصورت گھر میں رہائش پذیر ہے، ساری رات خوبصورت اور حسین گھر اس کے خوابوں میں آ کر اس کے دل کو منور کرتے رہے۔ صبح جب وہ اٹھی تو اسکا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا۔ شاہد حیران تھا۔ ثانیہ جیسی عقلمند اور قناعت پسند خاتون سے اس کو یہ امید نہ تھی۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا اسکی فطرت کا حصہ محسوس ہوتا تھا۔ اس نے شادی کے پچھلے دس سالوں میں ایسی ضد کبھی نہ کی تھی۔ پھر اپنی چیزوں کا یوں تمسخرانہ انداز میں تذکرہ کرنا..... شاہد کو اسکی گفتگو سے خوف سا آنے گا۔ لیکن ثانیہ کو سمجھانا اس کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔

''میں کاروبار سے یکمشت اتنی بڑی رقم نہیں نکال سکتا۔'' شاہد نے صاف گوئی سے کہا۔ ''رزق حلال میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ کچھ سال انتظار کرلو شاید کوئی ایسی صورت بن جائے کہ میں تمہاری خواہشات پوری کرسکوں۔ اللہ نے اب بھی بہتوں سے اچھا رکھا ہے ہمیں۔''

''پھر ہم قرض لے لیتے ہیں۔'' ثانیہ کی دیوانگی حد سے بڑھ گئی تھی۔

''ایسی کیا ضرورت ہے ثانیہ؟'' شاہد نے بے بسی سے کہا۔

اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا اسم پڑھ کر پھونکے کہ ثانیہ اپنی ضد بھول کر پہلے جیسی ہو جائے۔ ابھی چھ ماہ پہلے تو دیواروں پر رنگ کرایا تھا۔ قالین بے شک پرانے تھے لیکن ثانیہ کی سلیقہ مندی کی وجہ سے اتنے پرانے نہیں لگتے تھے۔ ہر وقت گھر کو صاف ستھرا رکھنا، قالین کو رگڑنا، فرنیچر کو پونچھنا، دیواروں کو صاف کرنا، گھر کو جھاڑنا ثانیہ کی صفائی پسندی اور سلیقہ مندی کا تو وہ بھی معترف تھا۔ لیکن اب جو یہ ضد چڑھی تھی۔ اس کو اتارنا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔

''کاش مینا تم اسلام آباد میں ہی رہتیں۔'' اس نے آہ بھر کر سوچا۔

آخر کار شاہد نے سوچا کہ اپنی ساس یعنی ثانیہ کی امی سے مشورہ کرلے، وہ معاملہ فہم اور دانا خاتون ہیں شاید وہ ہی ثانیہ کو سمجھانے اور سیدھی راہ دکھانے

میں کامیاب ہوجائیں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک رات جب کہ ثانیہ اپنے گھر کو نئے سرے سے سجانے اور سنوارنے کی پلاننگ کررہی تھی اور شاہد اسکو اس ضد سے باز رکھنے کی سر توڑ کوشش کررہا تھا، نتیجتاً دونوں کا جھگڑا ہوا۔ آخر کار شاہد نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور ثانیہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

رات کے 2 بجے تھے۔ ثانیہ روتے روتے سوگئی تھی کہ اچانک موبائل فون بجنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ موبائل سے مستقل بیل ہورہی تھی۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا پھر شاہد کو جھنجھوڑا، شاہد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دوسری طرف کی اطلاع سن کر وہ زور سے چلایا ''کیا؟''

ثانیہ اس کے چلانے سے بے حد گھبرا گئی ''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' اس نے شاہد کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کچھ نہیں'' اس نے اپنا ہاتھ چھڑالیا ''میرے کپڑے نکالو۔''

''آپ مجھ کو بتادیں کیا مسئلہ ہے؟'' ثانیہ کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔

شاہد کچھ نہ بولا۔ وہ کوئی نمبر ڈائل کررہا تھا۔

''پلیز آپ مجھے بتادیں۔'' ثانیہ نے رونے والے انداز میں کہا۔

''ہماری مارکیٹ کو آگ لگ گئی ہے۔'' اس نے جلدی جلدی کپڑے پہن کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔

ثانیہ چپ چاپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

شاہد کی نور مارکیٹ میں داؤں کی ہول سیل کی دکان تھی۔ اس کی پوری کی پوری دکان مال سمیت جل گئی تھی۔ وہ خود کو غم کے پہاڑ تلے دبا محسوس کررہا تھا۔ اتنے سالوں کا جما جمایا کاروبار راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ ثانیہ خود بھی اپنے ہوش وحواس میں نہ تھی۔ اب کیا ہوگا؟ یہ سوال دونوں کو جکڑ چکا تھا۔ دکان کی نئے سرے سے تعمیر اور پھر اسے مال سے بھرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ پھر گھر کے اخراجات بجلی، گیس کے بل، بچوں کے اسکول کی فیس، یہ خرچے کہاں سے پورے ہونگے۔ یہ سوال بھی راتوں کی نیندیں اڑائے ہوئے تھا۔ فی الحال آمدنی کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اب کیا ہوگا، کیا ہونے والا ہے۔ ثانیہ کے ذہن میں بے شمار سوالات چکراتے رہے وہ شاہد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی پھر اس کی نگاہیں جھک جاتیں۔

اور شاہد.....اس حادثے نے تو اس کی شخصیت ہی پلٹ دی تھی، وہ نرم خو،نرم مزاج شخص کوئی اور ہی روپ دھار چکا تھا۔ روزگار کی پریشانی،نقصان کے صدمے نے اسے بالکل بدل دیا تھا۔غصہ کرنا، بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑنا۔اس کی گویا عادت بن گئی تھی۔ ہر وقت چیخنا، دھاڑنا،معمولی بات پر بچوں کو مار پیٹ کرنا، طنزیہ فقرے، کاٹ دار نگاہیں، چبھتا ہو الہجہ،ثانیہ حیران تھی کہ وہ کیا کرے۔ ہر وقت باادب، باملاحظہ، ہوشیار،خبردار کی تصویر بنے رہنے کے باوجود وہ کوئی نہ کوئی بات ڈھونڈ نکالتا۔ پھر ایسا وار کرتا کہ ثانیہ تڑپ تڑپ جاتی۔ اگر معافی مانگتی تو ہاتھ جھٹک دیتا۔ قریب آنے کی ہر کوشش اس کو اور دور کر رہی تھی۔ ثانیہ حیران تھی کہ جو کچھ ہوا اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پریشان تو وہ بھی تھی۔تسلی کی اسے بھی ضرورت تھی ،لیکن شاہد اس کے لیے بے رحم ہو گیا تھا۔دن بڑے بوجھل اور اداس گزر رہے تھے۔ پوری مارکیٹ جل چکی تھی۔تین دن تک آگ بھڑکتی رہی تھی پھر بڑی مشکل سے آگ پر قابو پایا جا سکا۔مگر اب تک کسی کو مارکیٹ میں گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ معاملے کی تحقیقات ہو رہی تھیں۔قصور کسی کا بھی ہو،لیکن ہزاروں لوگ بیروزگار ہو چکے تھے۔ لوگ مارکیٹ کے باہر بیٹھے رہتے۔ حکومت سے درخواست کر رہے تھے کہ ان کو کاروبار دوبارہ شروع کرنے کی اجازت دی جائے، پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی تھا۔

آج رات کو شاہد کافی دیر سے گھر پہنچا۔ثانیہ بھوکی پیاسی بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس اشارہ دے رہی تھی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔شاہد غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ثانیہ دکھی نظروں سے اس کو دیکھنے لگی۔تسلی دینے کی خواہش کو اس نے بڑی مشکل سے دبایا۔ جانتی تھی کہ وہ بھڑک اٹھے گا۔نہ جانے کیا بات تھی جب بھی وہ ہمدردی کے دو بول،تسلی کے چند الفاظ بولنے کی کوشش کرتی شاہد آگ کا گولہ بن جاتا۔اور یہ آگ کا گولہ ایسی زبردست گولہ باری کرتا کہ ثانیہ بے دم ہو جاتی۔

آخر خاموشی کو شاہد ہی نے توڑا۔''میں گھر بیچ رہا ہوں۔''

''کیا؟'' ثانیہ ہڑبڑا اٹھی۔

ایسا محسوس ہوتا تھا۔جیسے اس کے کان بجے ہوں یا اس نے سننے میں غلطی کی ہو۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''اس نے آنکھیں

پھاڑ کر شاہد کی طرف دیکھا۔

''میں گھر سیل کر رہا ہوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔''تم سامان باندھنا شروع کر دو۔ایک ہفتہ کا وقت ہے۔''

''ہم کہاں جائیں گے؟'' ثانیہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔''کیا کرائے کے گھر میں رہیں گے۔ پھر کرایہ کہاں سے دیں گے؟'' وہ حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر بولی۔

''امی کے گھر پر'' شاہد نے مختصر جواب دیا اور اٹھ کر ہاتھ دھونے لگا۔

''کیا؟'' ثانیہ چیخ کر بولی۔

''آپ ہوش میں ہیں۔ میں آپ کی امی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' ثانیہ کا غم وغصے سے برا حال ہو گیا۔وہ بلا توقف بولتی چلی گئی۔

''پھر جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔'' شاہد کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔

اس نے بے نیازی سے کہا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ثانیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتی رہی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔اس نے بولنا چاہا لیکن منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ شاہد کو قائل کرنا چاہتی تھی،اس نے تمام حوصلہ جمع کر کے ایک بار پھر کوشش کی۔

''بات سنیے۔''اس نے مرتعش آواز میں کہا۔''امی کے گھر میں جگہ ہی کہاں ہے۔وہاں پہلے ہی زاہد اور سجاد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔'' اس نے شاہد کے بھائیوں کا نام لیا۔

''سجاد کے پاس پیسے جمع ہیں وہ آج کل گھر دیکھ رہا تھا'' شاہد نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر ثانیہ کی طرف دیکھا۔''میں یہ گھر اس کے ہاتھ فروخت کر دونگا۔میرے اوپر جو قرضہ ہے وہ ادا کرنا ضروری ہے، جب سے دکان جلی ہے،جن سے ہم مال ادھار پر لیتے ہیں وہ جان کو آ گئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ پہلے قرضے سے جان چھڑا لوں ایسا نہ ہو کہ کاروبار تو ہاتھ سے جا ہی چکا ہے عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں۔'' شاہد نے تفصیلی جواب دیا۔

''اور ہاں! شاہد نے اس کی طرف دیکھا۔'' گھر سامان سمیت دینا ہوگا۔اس صورت میں سجاد زیادہ قیمت دینے کو تیار ہے۔اس کی سردردی بچ جائے گی۔اس گھر میں ابا کے زمانے کا سامان پڑا

ہے، ہمارے گزارے کے لیے کافی ہے۔''

ثانیہ چپ چاپ خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دل ان درودیوار سے لپٹ رہا تھا، دہائی دے رہا تھا.....نہیں میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنی راجدھانی پر کسی کو قبضہ نہیں کرنے دونگی.....اس پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس گھر کا چپہ چپہ، کونا کونا اس کی محبتوں کا امین تھا۔ اچانک اس گھر کے درودیوار سے اس کو محبت محسوس ہونے لگی۔ جیسے ماں کو اپنے بچے سے۔ شاہد تو گھر سے چلا جاتا، وہ اس گھر کو بڑی محبت سے سنوارتی، نکھارتی، صاف ستھرا کرتی وہ بلاشرکت غیرے اس گھر کی مالکہ تھی۔ جہاں جی چاہتا وقت گزارتی، جب جی چاہتا اسے سجاتی بناتی۔ سیٹنگ تبدیل کرتی، کوئی اس پر اعتراض کرنے والا، نکتہ چینی کرنے والا نہ تھا۔ اب کیا ہوگا!

پھر اس نے سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک ایک چیز سے کوئی نہ کوئی یاد لپٹی تھی۔ کتنی محبت سے اس نے یہ سب اکٹھا کیا تھا! اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے چند ماہ پہلے والی اپنی کیفیت یاد کی، جب اسے اپنی ہر چیز حقیر لگ رہی تھی۔

اس کے آنسو آج بھی بہہ رہے تھے۔

مگر آج ان آنسوؤں کا مفہوم کس قدر مختلف تھا!!

☆☆☆

کہیں چاند راہوں میں کھو گیا

وہ جو تسبیح کے دانوں پر محرومیوں کا شکوہ پڑھتا تھا، جب اس کی فریاد سنی گئی تو وہ کپکپا اٹھا.....تشکیک کی سرحدوں پر گھومتے ایک انجان کی کہانی

جو مل گیا بندہ اس کو نہیں دیکھتا کہ اس کے ملنے میں اس کا کیا کمال ہے اور کیا حق، جو نہ ملا اسکی شکایت ہی شکایت اور پھر بغاوت..... یہ احساس کیے بغیر کہ کس سے یہ سرکشی کی جارہی ہے، جو اگر سرزنش بھی کردے تو انسان نہیں سہہ پاتا۔

عمر خیام اس وقت عمر خیام کے بجائے ایک بے حد عمومی سا، پریشان حال انسان لگ رہا تھا جس کے ذہن میں امید کا کوئی جگنو بھی نہ چمک رہا ہو۔ جس کا دم حبس اور گھٹن سے بند سا ہو رہا ہو۔ کوئی روزن بھی ایسا نظر نہ آیا ہو جہاں سے کوئی محبت بھرا جھونکا آتا ہو جو طاقتور بھی ہو اور مبارک بھی۔

ابوذر نے کرسی پر پہلو بدلا۔

''واقعی دکھ انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ زندگی کے کچھ دکھ تو ایسے ہوتے ہیں جن سے ہی بیشتر مسائل جنم لیتے ہیں۔ ٹھیک کہا آپ نے..... لیکن کیا آپ میرا ایک کام کرینگے۔ مجھے یہ بھی بتایئے گا کہ وہ کون سے سکھ ہیں جو آج اس وقت ہیں یا آئندہ آپ کے پاس نہ رہیں تو کیا ہوگا۔

ابوذر کی آواز میں حقیقت پسندی اور مضبوطی بھی تھی۔ مگر رسمی انداز میں وہ عمر خیام کے گرد پھیل رہی تھی۔

''آپ کے کتنے بچے ہیں ابوذر؟'' عمر خیام کے اچانک سوال پر ابوذر کا چہرہ لمحہ بھر کو بے تاثر ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔

''میرے بچے نہیں ہیں۔'' اس نے ایک جملہ میں جواب دے کر بات ختم کرنا چاہی اور نشست سے کھڑا ہو گیا۔

عمر خیام نے بے اختیار اسپر نگاہیں جما دیں، جن میں ان کہی پکار تھی۔ روح کی مسیحائی کی طلب تھی۔ ابھی تو ابوذر سے آنے والی لہروں نے اسے پرسکون کرنا شروع کیا تھا اور ابھی سے یہ جا رہا تھا، عمر خیام واقعی بے حد دلگرفتہ تھا۔ یہ پکار ابوذر تک بھی پہنچ گئی تھی۔

اس نے بے حد ندامت سے اپنے اوپر اچانک چڑھے خول کو دیکھا جو عمر خیام سے بے نیازی دکھا کر رخصت ہو رہا تھا۔

''اس نے یہ سوال کیا ہی کیوں؟'' ابوذر کے دل نے شکایت کی۔

''اسے کیا پتہ تم پر کیا بیتی ہے؟ اسے کیا پتہ تھا تم پر اس کا جواب آسان نہیں۔'' ابوذر کے دل نے اسے گھرکا۔

وہ تو خود مرجھایا ہوا تھا اس وقت نارمل کیفیت ہوتی عمر خیام کی تو وہ فوراً ہی مخاطب کی کیفیت کو پڑھ لیتا تھا۔ اس کی فوٹو گرافی کی مہارت میں جذبات کا مشاہدہ اولین مددگار تھا۔ اس وقت وہ صرف یہ جان سکا کہ ابوذر اب مزید رکنا نہیں چاہتا۔

''شکریہ ڈاکٹر آپ کا میں نے کافی وقت لیا۔'' اس نے ممنونیت سے کہا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ''ہم پھر کب ملیں گے'' لیکن نہ پوچھ سکا۔

''ہم عنقریب ملیں گے عمر خیام۔''

ابوذر نے وہ کہا جو اس کی خواہش تھی۔ حالانکہ ابوذر کا فوٹوز کا کام خصوصی ہدایت پر تیار تھا لیکن وہ ابوذر سے دوبارہ رابطہ کرنے کے لیے فوٹوز اس کے حوالے اس وقت نہ کرنا چاہ رہا تھا۔

اگلے دن صبح ناشتے کی میز پر حسب معمول اخبار پر سرسری نگاہیں دوڑاتے ہوئے اس کی نگاہ ایک تصویر پر ٹک گئی۔ اور پھر خبر نے اس کو زلزلہ کی سی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ سحاب کی تصویر تھی۔ ''نامعلوم وجوہات کی بنا پر جواں سال کالج کی طالبہ نے خودکشی کر لی۔ والدین کا غم سے برا حال ہے، کوئی بھی وجہ بتانے سے وہ قاصر ہیں۔ لیکن باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وہ محبت میں گرفتار تھی اور اس شخص کی کج ادائیوں سے دکھی تھی۔ وہ شخص شہر کا معروف نام ہے.....''

اور اسکے بعد کیا تھا، عمر خیام کی آنکھوں کے آگے آتا اندھیرا اسے کچھ پڑھنے نہ دے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ چکرا رہا ہے۔ سحاب! اُس نے سسکی لی تو تہمینہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا، وہ حسب معمول انعمت اور عمر خیام کے ناشتے کے درمیان گھوم رہی تھی۔

ڈولتے قدموں سے عمر خیام کھڑا ہو گیا۔ اس نے شکوہ کناں نظروں سے آسمان کو دیکھا۔ ''یہ بھی مجھ سے چھین لیا۔'' وہ بڑبڑایا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر کام پر جانے کے بجائے اسٹڈی روم میں بند ہو گیا۔ تہمینہ کتنی بھی شوہر کی دوسری عورت میں دلچسپی سے آگاہ ہوتی

لیکن اپنے سامنے اس کا نام سننا گراں ترین تھا۔لیکن عمر خیام کی ٹوٹتی کیفیت نے اس کو اس لمحے ناگواری سے زیادہ فکرمند کر دیا تھا۔ بے اختیار اخبار کا وہ صفحہ اس نے اٹھالیا جو ہوا سے پھڑ پھڑاتا ہوا میز پر ادھر ادھر حرکت میں تھا کچھ ہی منٹ میں وہ عمر خیام کی کیفیت کا سبب جان گئی۔ بے تاثر سی کیفیت کے ساتھ اس نے اس دروازے کو دیکھا جو بند تھا۔ جہاں پیچھے اس کا میاں ایک ایسی عورت کی موت کا غم منا رہا تھا جسے اس نے مارا ہے۔ وہ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ کل شام سات بجے سے جب یہ سانحہ،خبر بنا، آج صبح نو بجے تک ان کے کسی جاننے والے کا سحاب اور عمر خیام کے حوالے سے کوئی فون نہیں آیا۔ ورنہ لوگوں کی پر تجسس نگاہوں اور کھوجنے والے خیالات سے یہ بعید نہ تھا کہ اب تک وہ کتنے ہی ایسے سوالوں کو سن چکی ہوتی جن کا تصور ہی اسے مضطرب کرنے لگا تھا۔کون نہ تھا جو سحاب اور عمر خیام کے رابطوں کو نہ جانتا ہو! نام نہاد جدید سوسائٹی غیر محرم سے قربت کو ''دوست'' کا خوبصورت نام دے کر خرابی کو ڈھانکنا چاہتی ہے۔ہاں کوئی مجرم سے محرم بننا چاہے تو ہوس پرست اور عیاش کا لیبل فوراً لگا دیتی ہے۔عمر خیام اور سحاب کی ''دوستی'' بھی سب جانتے تھے۔تہمینہ بھی جانتی تھی۔کل رات سے وہ عمر خیام کا چہرہ بجھا ہوا سا بخوبی محسوس کر رہی تھی۔پوچھنے پر اسے مقابلہ میں ناکامی کا اس نے سرسری انداز میں بتایا تھا۔تہمینہ پر اس خبر نے کوئی اثر نہ ڈالا گو وہ عمر خیام کی اپنے شوق سے وابستگی سے خوب آشنا تھی،لیکن اشہد کی بیماری اور اپنے مرحوم سسر کی عمر خیام کو رزق کے حوالے سے نصیحت نے اس کو فوٹوگرافی سے بددل سا کر دیا تھا۔اب مقابلے میں اس کا شوہر جیتا یا ہارا اس کے لیے یکساں تھا۔لیکن اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس بند دروازے کو کھول عمر خیام سے پوچھے ''تم کس کے ہو؟ میرے ہو؟ تو میں زندہ ہوں۔سحاب کے ہو.....تو وہ مر چکی ہے.....آؤ کہ میرا ہر راستہ تمہاری ہی طرف جاتا ہے پھر تم کیوں غم منا رہے ہو؟''

اس خبر نے اس لمحے بھر کو جھٹکا ضرور دیا تھا لیکن پھر جیسے وہ شانت سی ہوگئی، وہ کانٹا جو ہر وقت اس کے دل میں سحاب کے نام سے چبھا ٹیس دیتا آرہا تھا یکدم غائب ہوگیا، حالانکہ وہ برملا اس بات کا دل میں اعتراف کرتی تھی کہ اس کے شوہر کے دل کا سفینہ ان دونوں کے مشترکہ ساحل پر تہمینہ کی غیر موجودگی کی وجہ

سے نئی دنیا کی طرف روانہ ہوا تھا لیکن اس میں خود وہ بھی بے قصور تھی۔ درد مسلسل سے وہ بھی گزر رہی تھی فرق صرف یہ تھا کہ عورت تھی، اپنے ساحل پر عمر بتا سکتی تھی، نئی دنیا کے لیے مہم جوئی عورت کی فطرت میں مرد سے بے انتہا کم ہوتی ہے اور کسی میں تو قطعاً نہیں ہوتی۔ جب کہ طبعاً مرد لشکری بنے حالت سفر میں ہی رہتے ہیں۔ اس لیے انہیں چار عورتوں سے بیک وقت طیب تعلق جوڑنے کی اجازت دین نے دی تا کہ بوجہ حالات نہ وہ مضطرب ہوں نہ معاشرے میں کسی غیر طیب عنصر کے پھلنے پھولنے کے حالات پیدا ہوں۔

سحاب کے حادثہ نے وہ کیا جو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ عمر خیام ہر چیز سے لاتعلق ہوگیا، ایسا نہ تھا کہ ذمہ داریاں ادا نہ کر رہا تھا لیکن ایسے جیسے کوئی لاتعلق سا شخص کسی کا نگراں بن جائے۔ بس ایک مشین کی مانند۔ بے تاثر اور خاموش۔ لوگوں کے استفسار بھرے فون ،کھودنے والے الفاظ، حواس سن تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے کٹے کٹے سے ہوگئے تھے۔ تہمینہ کو لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے اسکا دم گھٹ جائے گا۔ مقدر کی بارشوں نے میرے گھر کی بنیادوں کو ڈھا دیا۔ وہ اکثر سوچنے لگی تھی یاسیت اس پر سوار ہوگئی تھی۔ اور اسکے ساتھ ہی عمر خیام کا گھر جو نظام کے تحت چل رہا تھا بدنظمی کا شکار ہوگیا۔ ہر ترتیب الٹ چکی تھی۔ ہر نظم بکھرنے لگا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی سب کی آنکھوں میں، الفاظ میں ایک دوسرے کے لیے گلے ابھر آئے۔ گویا ماں کا، تہمینہ کا وجود تھا جو صبر مسلسل سے گزرتا رہا تو نظام اور رویے بھی الٹ پھیر میں نہ آئے لیکن جہاں اس کا ضبط جواب دے گیا، وہیں دھواں سا اٹھنے لگا۔ عورت بھی اللہ نے کیا مضبوط مخلوق بنائی ہے، پھاوڑا بے شک نہیں اٹھا سکتی لیکن مضبوطی کے، طاقت کے وہ کام کر جاتی ہے جو مرد نہیں کر سکتا، اور اس میں اس کا بھی کمال نہیں بلکہ خالق نے مرد اور عورت کے دائرہ کار ہی، نفسیات ہی جدا رکھی ہیں، دونوں کو ایک ہی حساب سے سمجھنا جہالت بھی ہے اور حماقت بھی۔

تہمینہ اب انعمت سے بھی غافل ہو جاتی تھی۔ اور اپنے آپ سے بھی۔ مہینہ ہو چکا تھا عمر خیام میں تبدیلی آئے، وہ اس کو بمشکل ہی پکارتا تھا۔ اس کا پر رونق چہرہ مرجھا چکا تھا۔ تہمینہ بغور اپنے میاں کو بستر پر لیٹا دیکھ رہی تھی۔ وہ سویا ہوا تھا۔ تہمینہ نے پوچھا بھی تو اس نے ''ٹھیک ہوں'' کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔ مگر اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے بے اختیار اس

کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامنا چاہا، کہ اسی وقت عمر خیام کا سرہانے رکھا فون وائبریٹ ہوا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ تہمینہ نے گہری سانس لے کر فون اٹھا کر اسکو تھما دیا۔ وہ اس کو دیکھ رہی تھی کہ بات کرتے ہوئے عمر خیام کے چہرے پر رونق کی لہرا بھر رہی تھی۔ کال نہایت مختصر تھی لیکن عمر خیام پر شگفتگی کا ہالہ چھاتا محسوس ہو رہا تھا۔ تہمینہ نے تجسس سے فون چیک کیا تو پتہ چلا کہ آخری کال ابوذر کی تھی۔ ڈاکٹر ابوذر کا نام پڑھ کر اس نے عمر خیام کے بدلتے انداز کو سوچا اور فون ہاتھ سے رکھ کر خود بھی لیٹ گئی۔

اگلی صبح بیٹوں کے اسکول میں پیرنٹ ٹیچر میٹنگ تھی۔ عمر خیام کا اس میں شریک ہونا ازحد ضروری تھا۔ یہ تاکید اسکول کی جانب سے تھی کہ بچوں کے والد امتحانات کے بعد ہونے والی اس میٹنگ میں ضرور آئیں۔ اور وہ ابھی تک عمر کو آگاہ نہ کر سکی تھی۔ کچھ عجیب سا ہی ماحول ان دنوں گھر کا تھا۔ صبح ناشتہ کی میز پر جب وہ آئی تو عمر خیام کے ساتھ بچوں کے اسکول جانے کے لیے تیار تھی۔ حالانکہ بدستور وہ لاعلم تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ اس کو اس وقت بھی بتائے گی تو وہ چلنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ لیکن اس کا خیال غلط نکلا اور وہ اس کی تمام بات توجہ سے سن کر بھی خاموش رہا۔

''میں نہیں جا سکوں گا میری ایک اہم میٹنگ ہے، تم خود چلی جاؤ۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بے حد دھیمے انداز میں بولتا کھڑا ہو گیا۔ ''اور ہاں گاڑی میں فیول ڈلوانا مت بھولنا۔ میرا خیال ہے تمہیں اسکی ضرورت ہو گی۔''

خیال بھری آواز میں اس نے چلتے چلتے تہمینہ کو ہدایت دی تو وہ گنگ ہو گئی۔ اسے لگا مدتوں بعد عمر خیام نیند سے جاگا ہو۔ عرصہ بعد اسے احساس ہوا ہو کہ اس کے وجود سے کتنی اور جانیں وابستہ ہیں۔ سحاب کے غم کا چولا جیسے کچھ اس پر سے کھسکا تھا تو کچھ اور منظر بھی ابھر اتھا۔ پھر وہ اپنی گاڑی کی چابی اٹھاتا گھر سے روانہ ہو گیا۔

وہ اپنے اسٹوڈیو پہنچا تو کچھ ہی منٹ بعد ابوذر سامنے تھا۔ اپنے اسٹوڈیو میں یہ اسکی ابوذر سے دوسری ملاقات تھی۔ اس نے فوٹو پہنچانے کیلئے کئی مرتبہ اس سے رابطہ کرنا چاہا تو فون اس نے ریسیو نہ کیا تھا۔ سحاب کی خودکشی نے پہلے ہی اس کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ ابوذر کے فون نہ اٹھانے نے اس میں کچھ اور شدت پیدا کر دی تھی۔ ''خدا خدا کرنے والے بھی بے حس ہیں۔'' اس

نے دل کی وحشتوں سے گھبرا کر ابوذر سے رابطہ کرنا چاہا تھا مگر نہ ہوا تو اس میں بھی خدا سے شکایت ہوئی کہ تیرے نام لیوا بھی ستم گر ہوتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ مسیحائی ان کے ہاتھ ہے تو اترا جاتے ہیں۔

مگر کل رات اچانک ابوذر کا فون آ گیا پورے مہینہ بھر بعد تو اسے لگا دماغ میں بنتے آبلوں پہ کسی نے ٹھنڈک کا پھاہا رکھ دیا ہو۔ اس نے پہلی بات ہی یہ کی تھی کہ وہ امریکہ گیا ہوا تھا اور اسی دن لوٹا ہے۔ فون رومنگ پر تھا۔ مگر از حد ضروری کالز کے علاوہ اس نے پاکستان سے کوئی کال اس نمبر پر ریسیو نہ کی تھی۔

''میں جانتا تھا عمر خیام آپ مجھ سے اپنے کچھ مسائل شیئر کرنا چاہتے تھے، میں نے آپ کی نگاہوں میں لکھے پیغام کو پڑھ لیا تھا، حالانکہ میں کسی کی ذاتی زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں اپنی صلاحیت نہیں لگاتا۔ لیکن نہ معلوم کیوں میں نے اپنے مزاج سے ہٹ کر اس دن آپ کو سنا۔''

ابوذر نے علیک سلیک کے بعد بات کی ابتدا ہی ان جملوں سے کی تو عمر خیام کے چہرے پر استعجابیہ سی کیفیت ہو گئی۔

''میں اپنی ذاتی زندگی کسی غیر متعلق شخص سے کبھی نہیں ڈسکس کرتا لیکن چونکہ مجھے شدت سے احساس ہے کہ آپ کے دل کو شیطان نے پراگندہ کر دیا ہے، اور اصل پناہ گاہ سے دور کر کے، دکھوں میں جھونک دیا ہے.....تو میں آپ کو اپنی زندگی کا رخ دکھانا چاہتا ہوں تا کہ آپ کو احساس ہو دنیا میں صرف آپ ہی نہیں ہیں جو غم کی بھٹی سے گزر رہے ہیں بلکہ اور لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں آپ نے سوچا بھی نہ ہوگا۔''

وہ لمحے بھر کو رکا۔ پھر گویا ہوا۔''میری شادی کو آٹھ سال ہو چکے ہیں ماشاءاللہ۔'' ابوذر نے اچانک یہ کہا تو عمر خیام کو کچھ حیرت ہوئی کہ یہ بات بتانے کا مقصد کیا ہے۔

''یہ جو اللہ نے مجھے ہدایت کی نعمت سے نوازا اسی کے ذریعے سے نوازا۔ وہ ایک یہودی ربی کی بیٹی ہے، لہٰذا کوئی بھی تصور کر سکتا ہے کہ اس کا اسلام قبول کرنا اس کے لیے کتنا کٹھن تھا لیکن یہ سب اس نے کیا۔ اسنے کیا سہا اور کیا قربان کیا، ہم یہاں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، امریکہ میں ہم ساتھ پڑھتے تھے اور پھر میری اور اس کی شادی کسی لَو افیئر کا نتیجہ نہ تھی۔ اسلام قبول کرنے سے صرف گھنٹہ بھر قبل اسنے مجھے کال کی اور یہ پوچھا کہ میں اس کے ساتھ شادی

کرسکتا ہوں، اسنے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مذہب تبدیل کررہی ہے۔ میں نے ازراہِ مذاق اس سے کہا کہ مجھے کیا فائدہ ہوگا تم سے شادی کرکے، تو اس نے بڑے یقین سے کہا تھا اتنا فائدہ جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اور پھر کوئی یقین کرے یا نہیں، اس گفتگو کے ایک گھنٹہ بعد مجھے اس کے اسلام قبول کرنے کا پتہ چلا اور پھر فوراً ہی میرے دل میں اس کے لیے اللہ نے جگہ بنادی اور ہم نے نکاح کرلیا۔

اس وقت میرے ذہن میں کوئی خدشہ اور کوئی خیال نہ تھا میری فیملی میں شادی حددرجہ پرسنل معاملہ سمجھی جاتی ہے۔ سوانکی مخالفت کا تو سوال ہی نہ تھا لیکن جو نتائج ہم دونوں نے اس کے گھر والوں کے ردعمل کے نتیجہ میں دیکھے ان کو سہتے ہوئے ثابت قدم رہنا اللہ نے ہی ممکن کیا۔''

ابوذر اپنے نجی راز عمر خیام سے شیئر کررہا تھا۔ محض اس لیے تاکہ رحمان کا بندہ رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ جو ناامیدی اور مایوسی میں گھر چکا ہے، روشنی اور عافیت کی جانب لوٹ آئے۔

''ابوذر اولا دکا غم بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ آپ.....'' عمر خیام بولتے ہوئے اچانک رک گیا۔ اس نے ابوذر کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ لیا تھا۔ اگلے ہی لمحہ وہ نارمل ہو چکا تھا۔ لیکن عمر خیام خفت محسوس کرنے لگا۔ پھر ابوذر کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں خفیف سے پھیلے۔

''عمر خیام! مجھے یقین ہے آپ جان چکے ہونگے کہ بچوں والا موضوع میرے لیے خوشگوار نہیں رہ پایا۔ اس لیے کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے تین نومولود بچے مٹی کے سپرد کرچکا ہوں۔ میرے اور ماریہ کے لخت جگر، نورِ نظر دنیا میں آتے ہیں اور کچھ ہی دنوں میں واپس جنت لوٹ جاتے ہیں، انہیں ہماری دنیا پسند ہی نہیں آتی۔''

عمر خیام کو لگا ابوذر کی آواز میں نمی اتر آئی ہے۔ اس کے لیے یہ خبر انکشاف تھی کہ ابوذر بھی زندگی کے اس درد سے ناآشنا نہیں جو وہ سہہ رہا تھا۔ بلکہ حقیقتاً اس سے بھی زیادہ۔

''میری بیوی ماریہ مغرب میں پلی بڑھی ہے جہاں محض بچے ہی زندگی کی متاع نہیں ہوتے، اور بہت سے کام زندگی کی رونق بنالیے جاتے ہیں۔ وہ بھی کارِ خیر کے بہت سے ایسے ہی مشاغل رکھتی ہے لیکن نعمت ملنے کے بعد اس سے محرومی پھر نعمت کا ملنا اور پھر

اس کا چلے جانا، یہ عمل اسے خاصا توڑ پھوڑ چکا ہے۔اس سلسلے کا تکلیف دہ پہلو یہ ہے عمر خیام کہ اس کو یقین ہے کہ اس پر جادو کا عمل کیا گیا ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتا لیکن وہ کہتی ہے کہ یہودی جادو خوب جانتے ہیں اور اس سے نقصانات پیدا کرنا انکی زندگی کے معمول کا حصہ ہے۔اس کو یہ یقین ہے کہ یہ سب اس کے میکہ والے دشمنی میں کرا رہے ہیں۔اس کا خدا پر یقین بے حد مضبوط ہے لیکن جادو کے برحق ہونے نے اسے خاصا ڈسٹرب کر دیا ہے۔معوذتین بھی پڑھتی ہے، خوبھی ڈاکٹر ہے مگر اب ہمارے تیسرے بچے کی موت جو محض دو ماہ قبل ہوئی، اسے نڈھال کر چکی ہے۔ ہمارا یہ بچہ سب سے زیادہ جیا پورے چھ ماہ! اسکی شکل بھی ماریہ کے بقول ماریہ کی بہن سے ملتی تھی جس نے ہماری ان دنوں مدد کی تھی جب ماریہ کے والد نے بھرپور مخالفت میں امریکہ کی زمین ہم پر تنگ کر دی تھی۔ بلکہ زمین پر سانس لینے کا حق بھی چھیننے کی کوشش خوب کی لیکن موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔'' ابوذر کی آنکھوں میں ماضی ہلکورے لے رہا تھا۔ میرا رب بڑا رحمان بڑا رحیم ہے وہ ضرور ہم پر کرم کرے گا۔''

ایکدم امید اور یقین کے ڈھیر سارے چراغ ابوذر کے جملے میں چمک اٹھے تو عمر خیام نے حیرت اور الجھن کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو مسلسل غم سے گزر کر بھی رب کی محبت پر یقین رکھتا تھا۔

''عجیب آدمی ہے، خدا نے اسے اتنا دکھ میں رکھا اور پھر بھی کہتا ہے کہ وہ بڑا مہربان اور رحیم ہے..... اسے تو کہنا چاہیے کہ وہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ اسے تکلیف ہے یا اذیت۔'' عمر خیام کے اپنے دل و دماغ میں خیالات کا ریلا اُمڈ رہا تھا۔

''امریکہ میں اسی لیے اچانک گیا تھا۔''

اس کے کانوں میں ابوذر کا یہ جملہ آتا تو اس کو احساس ہوا وہ تو اپنے خیالات میں اس قدر محو ہو چکا تھا کہ پتہ ہی نہ چلا کہ ابوذر اسکو کیا کہہ چکا ہے۔اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اس نے بڑی عقیدت سے اس ڈاکٹر کو دیکھا جس سے اس کی آشنائی بظاہر دوستی میں بھی نہ ڈھلی تھی لیکن وہ روح کے زخم دیکھ چکا تھا اور پھر اسکی مسیحائی کی فکر میں اپنی زندگی کے وہ رخ اسکو دکھا رہا تھا جو بالعموم تعلقات کی اس سطح پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔ وہ یہ سب کیوں کر رہا تھا۔ کیا وہ کوئی فرشتہ ہے؟ عمر خیام نے اس کے پر تلاش کرنا چاہیے، مگر وہاں تو ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ بس ٹھنڈک کی لہریں تھیں جو لگتا تھا ابوذر سے

خارج ہوکر عمر خیام کو ایسے پرسکون کر رہی ہیں جیسے کوئی غم غم نہ رہے، جیسے کوئی مشکل پہاڑ نہ رہے، جیسے کوئی طلب حسرت نہ رہے۔

عمر خیام اس کیفیت سے باہر نہ آنا چاہ رہا تھا لیکن آخر کب تک ابوذر اس طرح اس کے قریب بیٹھا اس کے وجود پر پھاہا رکھتا رہے گا۔

''انسان کی طاقت تو بڑی ہی محدود ہے عمر خیام! تم جو کسی پر اپنے کام کے لیے انحصار نہیں کرتے، ابوذر سے کیوں نرالی توقعات رکھ رہے ہو..... اس کا یہ احسان بہت بڑا ہے کہ وہ اپنے رتبہ اور مقام سے بالاتر ہو کر تمہاری مسیحائی تمہارے درد کی دوا کی فکر میں بیٹھا ہے۔'' اس کے دل میں آوازیں ابھریں تو وہ بے اختیار اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

ابوذر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا، اس کے پورے وجود میں ایک ٹھہراؤ تھا..... نہ کوئی اضطراب، نہ ہلچل۔

''عمر میں نے آپ سے کہا تھا کہ ان نعمتوں کی بھی لسٹ بنایئے گا جو آپ کے پاس ہیں، نہ ہوتیں تو کیا ہوتا۔ لگتا ہے آپ نے بنائی نہیں۔'' ابوذر کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔ آپ کے پاس معاش اور اتنا عمدہ درجہ پر رزق نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔'' یہ بات حقیقت ہے کہ دنیا میں ایک سے ایک قابل ہے، آپ سے زیادہ قابل فوٹو گرافر بھی ہیں کیا وہ سب عمر خیام کے درجہ پر کھڑے ہیں؟ یقیناً نہیں۔'' ابوذر نے سوال کا جواب بھی خود دیا۔

''رب نے آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازا۔ کیا میرے پاس یہ نعمت ہے؟؟'' ابوذر کے اس سوال نے عمر خیام کو سن سا کر دیا۔'' آپ کی بیوی ایک وفادار اور محبت کرنے والی ماں ہے۔ اس نے اپنے گھر میں کسی مسئلہ کو فساد کی سطح پر نہیں پہنچایا۔''

عمر خیام نے چونک کر ابوذر کو دیکھا جس کے انداز میں جتانے والی لہر تھی۔'' ایسی کتنی عورتیں آپ کا خیال ہوتی ہیں جو ایسی بات کو جو بیگم عمر خیام نے سہی، سہہ کر بھی گھر کو جہنم نہ بنائیں؟''

ابوذر کی اس بات نے جیسے زمین اور آسمان اسکی نظروں میں گھما دیئے تھے۔

''سحاب نے خودکشی کی لیکن کسی بھی معاملہ میں آپ پر آنچ نہ آئی۔''

ابوذر جو ابھی تک شفیق استاد تھا، نرم مسیحا تھا اب جیسے جراحی پر اتر آیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عمر خیام نعمتوں

کونہیں دیکھ رہا۔محرومیوں کا شکوہ تسبیح کے دانوں پر کررہاہے۔ زبان سے کرے یانہیں اسکے جذبات کا اظہاراس کارواں رواں کررہاہے۔

''سحاب کے بارے میں ہر وہ شخص جانتا ہے جان چکا ہے، جوعمرخیام کو جانتا ہے،بیگم عمرخیام کے بارے میں بھی وہ سب جانتے ہیں جو اس مشہورفوٹو ایکسپرٹ سے آشنائی رکھتے ہیں۔''

ابوذر نے اس کی الجھن پھرجان لی تھی۔ بنا کہے، بنا سہے، عمرخیام کے ہونٹ بے ساختہ بھینچ گئے تو ابوذر نے ایک گہرا سانس لے کراسکا کندھاتھپتھایا۔

''عمر جوہمیں ملا ہے اس میں ہمارا کمال کیا ہے بھلا؟ اور جونہ ملااس پرحق دار ہونے کا ہم کیا درجہ رکھتے ہیں، دینے والے نے جودیا، اعتراف نعمت نہ کیا، شکرانہ بھی نہ کیا، جونہ دیا اس پر روٹھنے کا کیا جواز؟؟ مالک الملک ہے،دےتو.....نہ دےتو،تو پھروہ مہربان ہوا نا جو ہم کو دن رات نعمتیں دیتاہے، بے گنتی بے حساب۔''

نعمتوں کے ذکر پرعمرخیام کے چہرے پر بےیقینی سی ابھرآئی۔ابوذر نے اسکو ناسمجھ بچے کے طور پر سمجھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیااور کچھ توقف کے بعد بولا۔

''عمر! ناشکری اپنے آپ پرظلم ہے۔''اسکی آواز میں حلاوت تھی، یقین تھا،اوررب پراعتمادتھا۔

''کچھ عرصہ سے میری ٹانگ زیادہ دیر بیٹھنے سے سن ہوجاتی ہے،اب بھی یہ ہی کیفیت ہے،ڈاکٹرکوبھی ڈاکٹر کی ضرورت ہے،''ابوذر نے میز پر ہاتھ جما کر کھڑے ہوئے دھیمے سے کہا تو اس کی باتوں میں گم عمرخیام نے آگے بڑھ کراس کا بازوتھام لیا۔

''آپ کادل بہت مہربان ہے۔بہت محبت کرنے والا،ایک لمحہ کوبھی احساس نہ ہوا کہ ڈاکٹرابوذر سے میرا کوئی تعلق نہیں، مجھے آپ کی طرح دل میں اترنے والی باتیں کرنا تونہیں آتیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کا رب مجھے بھی اپنی رحمت سے محروم نہ کرے گا۔''

''آپ کا رب نہیں ہمارا رب۔''ابوذر نے عمرخیام کی تصحیح کی''اورآپ اللہ کی رحمت سےمحروم کب ہیں۔ایک انسان کا دوسرے انسان کی دائمی بھلائی کے لیے بنا رشتے کے اس کا خیرخواہ بن جانا اسکی رحمت ہے.....چاہت ہے''

ابوذر نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر جماتے ہوئے کہااور باہر کی جانب قدم بڑھادیئے۔

عمر خیام نے کمرے میں روشنی سی اترتی ہوئی محسوس کی اور اسکو رخصت کرنے باہر آیا تو آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ برسنے والی ہلکی سی پھوار اس کے چہرے پر گری تو نادیدہ کثافتیں ماند پڑتی محسوس ہوئیں۔

''مجھے راحتیں عطا کردے۔ رب، تکالیف کا دور اب ختم کردے۔'' نہ جانے کتنی مدت بعد اس نے اپنے رب کو پکارا تھا۔ دل کا درد آنکھوں میں نمی بن کر آنے لگا تو وہ اسٹوڈیو میں پلٹ گیا۔ وہ شخص جو کبھی زندہ دل کہلاتا تھا اس وقت کیسا پژمردہ تھا، جیسے مرجھایا ہوا پودا۔ جس کا رنگ پھیکا ہو چکا ہو، شاخیں جھکی ہوں۔

''کیا محض ایک مقابلے کی ناکامی نے میرا یہ حشر کردیا ہے؟''

اسٹوڈیو میں لگے شیشوں کے آگے سے گزرتے ہوئے عمر خیام نے اپنے ابھرتے عکس پر نگاہ ڈالی اور خود سے سوال کیا۔

''ناشکری اپنے آپ پر ظلم ہے'' اس کے ذہن میں ابوذر کی سرگوشی ابھری تو اس نے گہری سانس لی۔

''میرے رب!'' اس نے بے اختیار روح میں سرشاری کی لہر محسوس کی جب یہ کہا۔ ایسے جیسے روح ہلکی پھلکی ہو کر کسی محبت کرنے والے سے مخاطب ہو گئی ہو جس کی نرم نرم سی نگاہیں اسپر ہوں اور وہ اپنی محبتوں اور خیر خواہی میں اس کو ملفوف کر رہا ہو۔

''مجھے ہر طرح کے غم اور دکھوں سے نجات دے دے، برائی سے محفوظ رکھ کر مجھے شکر کرنے والا بنا دے۔''

دل سے ابھرنے والی دعا نے آسمان کی رفعتوں پر پرواز کر لی تھی۔ آفس کی میز پر رکھا موبائل کال کی آمد ظاہر کر رہا تھا۔ تہمینہ کا نام آتا دیکھ کر بے اختیار اس کا دل دھڑک سا گیا۔ ''خیر ہو بس'' اس نے دل میں دعا کی اور فون ریسیو کر لیا۔

''عمر! انی واپس لوٹ گئی'' تہمینہ کی آواز کپکپا رہی تھی اور رونے کی شدت سے عمر کو لگ رہا تھا کہ آنسو شاید ریسیور سے بھی امڈ پڑینگے۔ ایسی خبر اتنے اچانک اور اتنی غیر متوقع سن کر اس کا دل اور ذہن بالکل ہی بے تاثر سا تھا۔ نہ کوئی سوال ابھر رہا تھا اور نہ تڑپ اٹھ رہی تھی کیا، کیسے، کیوں، کچھ بھی تو اس کے اندر نہ پیدا ہو رہا تھا، تہمینہ کیا کہہ رہی ہے، وہ تو بس دکھ کی سِل اپنے اعصاب سے کھسکتا محسوس کرتے ہوئے سن رہا تھا۔ ایسے جیسے تیز دھوپ میں چلتے سایہ آجائے۔

☆☆☆

بڑی ہی راحت کا احساس ہوا تھا، انسان واقعی بڑا ہی کمزور پیدا کیا گیا ہے لیکن پھر بھی بڑا ہی گھمنڈی بنتا ہے۔ میز کی چکنی سطح پر گرتے آنسو باپ کا خاموش غم ظاہر کررہے تھے۔ جس نے رب سے فریاد کی تھی راحتوں کے لیے، سکون کے لیے، خوشیوں کی سوغات کے لیے، ماں نے بھی سسکتے ہوئے ایسی دعائیں کی تھیں جن میں انعمت کے لوٹ جانے کی خواہش بہت طاقتور تھی اور دعا قبول ہوگئی تھی۔ عمر خیام نے تو بس کچھ دیر قبل رب کو پکارا تھا۔ اور فریاد کا جواب اتنی سرعت سے آیا تھا کہ اس کی ہستی میں اس طاقت ور اور بااختیار ہستی کے شعوری احساس نے لرزہ سا پیدا کر دیا تھا۔

''تو رحیم ہے تو کریم ہے۔'' دل اپنی نافرمان روش پر رو رہا تھا۔ تصور میں اپنی سرکشی اور رب کے اختیارات نے اس کو کپکپا دیا تھا۔ ایک گمشدہ بندہ رب کی جانب لوٹ چکا تھا۔ اپنی اصل کی جانب جہاں راحت تھی، غم تھا تو حلاوت بھی تھی، آزمائش تھی تو سکینت بھی تھی۔ رب سے جڑتے ہی اسے اپنی زخمی ذات اس نفع اور نقصان سے بالا ہوتی لگنے لگی جو اسے دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہے تھے۔ انعمت جا چکی تھی لیکن باپ کے لیے راستہ روشن کر گئی تھی۔

طوافِ زیارہ

منیٰ سے عرفات، عرفات سے مذدلفہ، مذدلفہ سے منیٰ اور منیٰ سے جمرات.....حج پر جاتے ہوئے ترتیب یاد کرلی تھی لیکن عقل کا خانہ چھوٹا تھا، تاریخ اور مقام بھول جاتی تھی۔ اب لگتا ہے ہر چیز خواب وخیال..... حقیقت بس یہی۔ جو وہاں دیکھی اور دل ودماغ پر نقش ہوگئی۔

رمی کرنے سے فارغ ہوئے تو اردگرد کا ہوش آیا۔ دائیں جانب سعودی سیکیورٹی کے عملے کی بھاری بھرکم تعداد ناگہانی حادثے سے بچنے یا مدد کے لیے موجود تھی۔

واپسی کا راستہ بہت تکلیف دیتا ہے۔ راستہ لمبا بھی ہوجاتا ہے اور بار ہارک کر پوچھنا پڑتا ہے۔ ہمیں خیمے سے جمرات پہنچنے میں دس منٹ اور واپسی میں ایک گھنٹہ دس منٹ لگے۔ جبکہ شازیہ کا قیام منیٰ اسٹیشن ایک پر تھا جو کہ ریلوے اسٹیشن کے حدود اربعہ میں ہی تھا۔ وہیں سے ٹرین میں بیٹھتے اور جمرات اسٹیشن جو کہ جمرات کا تھرڈ فلور ہے پر اترتے۔ شیطان مردود کی کنکریوں سے تواضع کرکے وہیں سے ٹرین پر بیٹھتے اور کیمپ میں جا اترتے۔ جس حد تک بھی انسان تصور کرسکتا ہے سہولت مہیا کرنے کی یہ عربوں کی صفت ہے کہ اللہ نے چھانٹ کر کے اپنے اور اپنے محبوب کے گھر کی میزبانی ان کے سپرد کردی وگرنہ اقوام تو اور بھی بہت سی تھیں لیکن بشری تقاضوں سے کچھ کمیاں کوتاہیاں ہیں اللہ درگزر فرمائے۔ اگر میری تحریر ارباب اقتدار کی نظر سے گزرے تو عرب وزارت حج کو ایک تجویز دینا چاہتی ہوں کہ عرفات میں جو شاہ کی طرف سے لحہ بہ لحہ مہمان نوازی کی جاتی ہے، ہر ممکن سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں وہاں پر ''میدان حشر'' کا تصور پیدا کرنے کے لیے ہر ملک کو بس چند ایک خیمے دینے چاہیں اور راشن بھی خشک..... چند گھنٹے ہی تو ہیں..... بھوکے رہ بھی لئے تو کیا حرج ہے! جبکہ جمرات جاتے ہوئے جہاں شیطان کو کنکریاں مارنا ہیں وہاں پہ تازہ دم ہونے کی ضرورت ہے جبکہ وہاں کسی قسم کی سہولت نہیں ملتی۔ سڑکوں پر راستہ بتانے کو بھی غیر اقوام ہی کے لوگ ہوتے ہیں راستہ بھولنے کا وہاں سو فیصد امکان موجود رہتا ہے بلکہ میں نے تو لوگوں کے منہ پر دو باتوں کو

''زبان زدعام'' کی طرح پایا۔

ایک، ہر حاجی منیٰ میں راستہ بھولتا ہے۔ یہ اس کے حج قبولیت کی چھوٹی سے نشانی ہے۔

دوسری، جس کی کنکری شیطان کے ''ضمیر'' پر لگتی ہے وہ منیٰ میں ایک دفعہ تو ضرور ''آزمایا'' جاتا ہے!

حج کی قبولیت کی تو ہم نے ایک اور بات ہر بندہ بشر کے منہ سے سنی کہ حج کے دوران میں جس حاجی کو بخار یا گلا خراب ہو جائے اس کا حج قبول ہوتا ہے۔

خیر تفنّن برطرف! یہ احادیث تو نہیں، خلق خدا کے تجربات ہیں جو ہم نے بھی کیے۔

آمدم برسر مطلب، جمرات جاتے ہوئے تینوں دن حاجیوں کو سہولت فراہم کرنا سعودی حج مشن کے نزدیک غالباً اتنا زیادہ ''کارِ ثواب'' نہیں ہے!!

بہرحال پہلے دن کنکریاں مارنے کا عمل اتنا آسان اور اچھا لگا کہ سب سے پہلے جہانیاں فون کر کے امی کو اطلاع دی۔ آپ کی صاحبزادی نے خود ''صف اول'' کی مجاہدہ بن کر شیطان کو کنکریاں مار دی ہیں۔

کیمپ میں واپس آئے تو حاجیوں کی تعداد پہلے سے کم تھی۔ ظاہر ہے اب حاجی تقسیم ہو گئے۔ کوئی کنکریاں مارنے گیا ہے تو کوئی طوافِ زیارہ کرنے، کوئی سر منڈوانے، کوئی ''پہلے پیٹ پوجا فیر کم دوجا'' (اول طعام بعد کلام) کے لیے غائب تھے۔ تنہائی اور گرمی دونوں ہی تنگ کر رہے تھے دل چاہ رہا تھا اڑ کر طواف زیارہ کے لیے روانہ ہو جائیں مگر میاں صاحب نے اگلے دن کا کہہ کر چپ کروا دیا۔ پہلے دن ٹیکسی والے سو دو سو ریال سے کم نہیں لیتے رش بھی زیادہ ہوتا ہے۔

خیر اگلی رات کو ہم کیمپ کے دس بارہ لوگوں کے ہمراہ مکہ روانہ ہوئے۔ رات کے دو اڑھائی بجے یہ قافلہ پیدل روانہ ہوا اور پچیس تیس منٹ چلنے کے بعد ایک ویگن والے سے غالباً بیس ریال فی سواری پر مک مکا ہوا۔ اس نے جب حرم کی حدود میں ویگن روکی تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔

رات بھر جاگنے اور بے آرامی کی ساری کوفت ایک ہوا کے جھونکے نے دور کر دی۔ اتنے میں فجر کی اذان شروع ہو گئی۔ جلدی جلدی باب عبدالعزیز سے اندر جا کر نماز ادا کی اور طواف زیارہ کے لئے پٹرول یعنی چائے پانی کا بندوبست کیا اور باب عبدالعزیز کے برآمدوں سے گزرتے ہوئے حرم میں داخل ہوئے

توانسانوں کا ایک سمندر تھا جو طواف کرنے میں مصروف تھا۔

بسم اللہ پڑھ کر حجرا اسود کی سیدھ سے ہم بھی مطاف میں گھس گئے۔

میں نے حرم بلکہ مطاف میں ایک چیز نوٹ کی کہ دور سے مطاف میں نظر ڈالیں تو لگتا ہے پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ جوں جوں قریب جائیں آپ کو نسبتاً کم رش محسوس ہوگا اور مطاف کے اندر جانے پر تو کچھ نہ کچھ خالی جگہ بھی مل ہی جاتی ہے۔ بہرحال میں نے جونہی بیت اللہ پر نظر ڈالی، دیوانے مستانے اردگرد پروانوں کی گھومتے نظر آئے۔ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے غڑاپ سے اندر چلی جاتی۔ اللہ مالک ہے، کا احساس کچھ سوچنے ہی نہ دیتا اور یہ بھی کہ طواف کرتے ہوئے یا مطاف کی حدود کے آغاز میں زیادہ رش ہوتا ہے یا پھر حطیم کے پاس، درمیانی جگہ کافی حد تک خالی ہوتی ہے میں نے اپنی یہ رائے جس کو بھی دی اس نے واقعی اسکی تصدیق کی۔

پہلے دو تین چکر نسبتاً کم رش میں لئے تیسرے چکر کے اختتام پر ریلے کے ریلے اندر آ گئے۔ دوسری طرف سورج طلوع ہونے کا منظر۔

زندگی میں جب بھی سورج طلوع اور غروب ہونے کا منظر دیکھا اس کی الگ ہی شان ہوتی تھی۔ جنگلوں، پہاڑوں، میدانوں میں الگ انداز۔ اور یہ صبح تو زندگی کی ایسی صبح ہے کہ چھم سے یادوں میں آدھمکتی ہے۔

بیت اللہ کے عقب میں باب عبدالعزیز کی طرف سے زمزم ٹاور کی طرف سے نکلتا نارنجی اور پھر آتشیں گولہ..... سرگوشیاں کرتا..... بیت اللہ کو دیکھ کر مسکراتا لیکن انسانوں کے گناہوں پر قہر برساتا..... میں ایک نظر بیت اللہ پر ڈالتی دوسری طرف اس گولے پر جس کو چند لمحوں کے بعد ہمارے سروں پر آگ کی طرح دہکنا تھا۔ کس قدر خوب صورت منظر تھا!

اوپر کی جانب اٹھتا ہوا سورج جیسے پوچھ رہا ہو ''اے بیت اللہ کے رب تھوڑا سا اوپر ہو جاؤں؟؟'' اجازت ملنے پر شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ اور اوپر ہوا گلابی رنگ نارنجی بن گیا۔ جونہی اس نے پوری آنکھ کھولی، انسانیت کو اپنی سطح سے نیچے گرتا دیکھا اس کا رنگ نارنجی سے آتشیں ہو گیا۔

اور وہ شفق کا منظر!! پھر ضحیٰ کے وقت کی دھوپ .....کتنی ہی احادیث اور سیرت کے واقعات ذہن میں

آئے مجھے ادیبوں کی اس تصوراتی دنیا سے اپنے آگے کے ایک گروپ کی تیز پاٹ دار آواز نے بیدار کیا جو دس پندرہ حاجیوں پر مشتمل تھا۔ لمبے چوڑے گورے چٹے لوگ لبیک یا حسینؓ یا حسنؓ اور پھر لبیک یا محمدؐ کی صدا لئے!!

میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ لبیک یا حسینؓ..... سڑکوں سے خانہ کعبہ کے اندر آنے کی لمبی داستانیں ہیں خاکم بدہن لگتا ہے یہی فتنہ قیامت کے قرب کے عالمی فتنوں میں سے ایک نہ ہو جائے۔ مدینہ میں فقہ جعفریہ کی سرگرمیاں مسجد نبوی میں جنت البقیع کے آس پاس عروج پر رہتی ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی گروپ آہ وزاری اور گریہ میں مصروف ہوتا ہے۔کالی عبایا والی ایرانی خواتین اور سرخ سفید چہروں والے ایرانی مرد۔ ایک نہ ایک ذاکر پہلے بیان کرتا پھر باقاعدہ آواز کے ساتھ رونے سے ماتم تک نوبت جا پہنچتی۔ جہاں کوئی گروپ ماتم میں مصروف ہوتا وہاں فوراً سعودی سیکیورٹی کا عملہ موجود ہوتا۔

مسجد نبویؐ میں مجھے پہلا دن تھا جب اشتیاق جنت البقیع گئے مجھے اندر جانے کی اجازت نہ ملی تو میں باہر کھڑی ہوگئی۔ وہیل چیئر پر ایک ایرانی خاتون نے جنت البقیع کی دیوار کو ہاتھ لگایا اور پھر چوما اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔اس کے رونے سے زیادہ تیزی اس کے بہنے والے آنسوؤں میں تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد نوجوان لڑکا اس کی وہیل چیئر لینے آیا تو میں نے اس کو رونے پر ترس کھا کر اس لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے اشارہ کیا۔

''خواہر،عقب گاہِ قبرستان''

اس پر اس نے اس خاتون کو جو چہرے مہرے سے اس کی والدہ لگ رہی تھیں بتایا کہ قبروں کی زیارت اس کے عقب سے ہوگئی۔ وہ وہیل چیئر لے کر جا رہا تھا اور مجھے من من بھر کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔خانم نے میرا ہاتھ چوم کر الگ شکریہ ادا کیا۔

خیر مدینہ کے برعکس مکہ میں مجھے بس یہی ایک سین نظر آیا۔ بہرحال اس سے ایک خیر یہ برآمد ہوئی کہ اب طواف کے اگلے چکروں میں میری دعاؤں کا رُخ امت مسلمہ کے اتحاد اور فرقوں کے خاتمے پر ہوگیا۔

طواف کے اگلے چکر کچھ زیادہ دیر میں مکمل ہوئے پھر بھی ایک گھنٹے میں ہمارا طواف زیارہ الحمدللہ مکمل ہوگیا۔ حج کے نام کے ساتھ طواف زیارہ کے مشکل ہونے کا ڈراوا دیا جاتا تھا۔باجی اور الطاف بھائی بار بار

کہتے علی الصبح کریں۔ اتنی آسانی سے ہوا کہ الحمدللہ، یقین نہیں آرہا تھا۔ پھر سعی کرنے گئے۔ سعی بھی الحمدللہ آسانی سے ہوگئی بس آخری چکروں میں لگتا تھا پاؤں اٹھانے سے پہلے پوچھنا پڑتا ہے،''اجازت ہے؟'' بہرحال''اماں ہاجرۂ'' کا تصور سعی کو ازحد آسان کردیتا ہے اپنے آپ میں مگن ہوکر دوڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشتیاق بچھڑ گئے۔

بار بار فون کرتی لیکن سگنل بند ہوتے۔ بیس پچیس منٹ ذہنی اذیت رہی۔ بالآخر یہی نتیجہ نکلا کہ اپنی مخصوص جگہ باب فہد کے پنکھوں کے نیچے چلی جاؤں انہیں میسج پڑھنے کی عادت نہیں وگرنہ کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ باب فہد کے پنکھوں کے نیچے نتیجتاً بہت آسان تھا میں دروازہ کا نمبر پڑھتی۔ اگلے دروازے پر جاتی اس سے اندازہ ہوجاتا تو اگلے دروازہ پر نمبر بڑھ جاتا تو باب فہد قریب ہوتا مثلاً اگر دروازہ نمبر چھیاسٹھ ہے اگلے دروازے پر سرسٹھ(67) نمبر ہے تو باب فہد کے پنکھے سو نمبر کے قریب تھے۔

وہاں کچھ دیر بعد یہ بھی پہنچ گئے۔ طوافِ زیارہ مکمل ہونے کی مبارکباد دی۔ ساتھیوں سے رابطہ کیا تو پتہ چلا وہ ابھی کچھ دیر میں آئیں گے۔ ہم فارغ رہنے کی بجائے کھانا کھانے چلے گئے۔ قربانی کا تازہ گوشت کھا کر واپس آئے تو ظہر کی اذان کا وقت قریب تھا۔

نماز پڑھ کر پھر منیٰ روانہ ہوئے۔ کسی نے بتایا تھا کہ دس ریال فی سواری میں اے سی کوچز چلتی ہیں۔ ایک کوچ منیٰ، منیٰ کا الارم بجا رہی تھی۔ سنی سنائی پر یقین کرتے ہوئے اشتیاق نے اشارہ کیا اور کوچ رک گئی۔

ٹکٹ کٹوانے لگے تو تیس تیس ریال کا مطالبہ ہوگیا۔ بس اس پر اشتیاق کا موڈ سخت خراب ہوگیا۔ میں نے انہیں''کول ڈاؤن'' کرنے کی بہت کوشش کی۔ حج میں ممنوعہ کاموں کا ذکر کیا لیکن یہ تڑخ کر بولے۔

''تم نے یہ طے کر رکھا ہے کہ میرے مقابلے میں ان عربوں کی لازماً حمایت کروگی۔''

چلو جی اب منہ پر تالا لگانا پڑا۔ یہاں تک کہ منیٰ آگیا۔ ہم اترے۔ جذبات بلکہ غصہ پر قابو پانے میں بہت دیر لگی۔ اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر پھر شیطان کی خاطر تواضع کے لئے روانہ ہوئے۔ اور جلدی فراغت مل گئی۔ منیٰ میں دوسرا دن بھی بخیر و عافیت گزر گیا۔ اب کیمپ پہنچتے ہی بیگ سے سوٹ نکالا، غسل خانے کے

گرما گرم پانی سے ٹکور ہوئی احرام اتارا۔رب کا شکریہ ادا کیا اور نماز کی ادائیگی کے بعد کیمپ کی خواتین کو درس کا منتظر پایا۔آج سورۃ ملک کا ترجمہ اور مختصر سی تشریح بیان کی۔چونکہ اپنا مسلک ''وحدت امت'' رہا ہے اس لیے سبھی خواتین کو مطمئن دیکھا بلکہ ہر کوئی اپنے اپنے مسئلے اور مسلک کو شیئر کرنے کی کوشش میں ہے۔اپنے ناقص علم سے جتنا مطمئن کر سکتی تھی کیا۔الحمدللہ سب خواتین نے درس کے بعد بہت خوشی کا اظہار کیا۔ٹیلی فون نمبر لیے گئے۔آئندہ رابطوں کے وعدے ہوئے اور چائے کا کپ لے کر سونے کے لئے لیٹ گئی گو نیند آنا بہت مشکل تھا۔شور شرابا، لائٹ اور اسے سی چلنے کی آواز.....
پھر بھی گھنٹہ ایک نیند آئی اور تہجد کے لئے وقت ہی وقت تھا۔اب مسئلہ گدے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا تھا۔

☆☆☆

ذرا لندن تک

اگر پاکستانی ہائی کمیشن لندن میں نہ ہوتا تو ہم وہاں کے مناظر آنکھوں میں مقید کرنے کے موقع سے محروم رہ جاتے۔ میرے شوہر ڈاکٹر آصف او ربیٹے کے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہونے کو تھی چنانچہ تجدیدِ میعاد کی خاطر ہم نے لندن کی جلد راہ لینے کی ٹھانی۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اتوار اور پیر کا دن منتخب کیا۔ پاکستانی ہائی کمیشن پیر سے جمعہ تک کھلتا ہے۔ گویا پیر کا دن تجدیدِ میعاد اور شام کا چناؤ سیر سپاٹے کے لئے کرنے کے ساتھ ساتھ اتوار سفر اور تھکان اتارنے کے لیے مختص کیا۔ ہمارے پروگرام عام طور پر اتنی جلد بازی میں بنتے ہیں کہ کبھی کبھار قیام کے لئے مناسب ہوٹل ملنا مشکل ہو جاتا ہے اور ہم گھنٹوں ہوٹلوں کی ویب سائٹس کھولے سر پکڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ کہیں کمرے کی قیمت آسمانوں کو چھوتی نظر آتی ہے تو کہیں پاکستانی ہائی کمیشن سے ہوٹل کا فاصلہ طوالت کی حدود چھو رہا ہوتا ہے۔ یہی حال اب کی بار بھی ہوا تو ہم نے اگلی بار جلد بازی کے بجائے کم از کم ہفتہ دو ہفتے پہلے پلان بنانے کا عزم کیا۔

آصف نے پیر کے دن جاب سے چھٹی بھی لے رکھی تھی۔ چنانچہ چار و ناچار انہیں دنوں میں مناسب کمرہ ڈھونڈنے میں سرگرداں ہو گئے۔ قدرت نے ہماری حالت پر رحمت کے دروازے کھولے تو انٹرنیٹ پر اچانک آصف کو مناسب قیمت اور پاکستانی ہائی کمیشن سے صرف چند منٹ کی مسافت پر ایمبسیڈر ہوٹل مل گیا۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اسی لمحے انہوں نے بکنگ کرادی۔ سیر سپاٹے اور تفریح کے مناسب مقامات تلاش کرنے کی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے میں نے بکنگھم پیلس اور مادام تساؤ کا انتخاب کیا۔ ان تفریح گاہوں کی ضروری معلومات قلمبند کرنے کے بعد اگلا مرحلہ سامان پیک کرنے کا تھا جو روانگی سے پچھلے روز بھاگم بھاگ مکمل کیا۔

۲ دسمبر ۲۰۱۲ء بروز اتوار ہماری صبح خیر و عافیت کی دعائیں کرتے اور تخیلات کی لہروں میں بہتے ہوئے ہوئی۔ سورج کی کرنیں ہمارے چہروں پر پڑ کر خوشیوں

کی روشنی منعکس کرنے لگیں۔ ہمیشہ برطانیہ کے شمال کی جانب سفر کرنے والے آج جنوبی سمت کے مسافر تھے۔ آصف ایک بار پہلے بھی لندن گھوم چکے تھے مگر اس سفر میں میں اور ہادی ان کے ہمراہ نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ لندن کے رش کے بارے میں بتایا تھا مگر اب میں بذاتِ خود اپنی نظروں سے وہاں کی رعنائیاں سمیٹنا چاہتی تھی۔

ہم نے سفر کا آغاز تقریباً صبح کے ۱۰ بجے کیا۔ سورج شاید ہماری خوشی کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ تبھی سارے سفر کے دوران ہماری آنکھوں کے سامنے کرنیں بکھیرتا رہا۔ ہم جس سڑک پر مڑتے سورج سامنے آجاتا اور ہماری آنکھوں کو چندھیانے لگتا۔ شاید وہ ہمارے جگمگاتے چہروں کو دیکھ کر اس خدشے میں تھا کہ اس کے مقابلے میں زمین کو تین نئے چمکیلے سورج مل گئے ہیں۔ جب ہم لندن کے مضافات میں پہنچے تو گھڑی دو بجا رہی تھی اور آصف کی بیان شدہ رش کی باتیں حقیقت بن کر سامنے آنے لگی تھیں۔ گویا سارا شہر بیک وقت سڑکوں پر آمڈ آیا تھا۔

''اُف کتنا رش ہے!''

اس جملے کو ہم لمبی قطاروں میں گاڑی کھڑی کئے قدرے پریشانی سے بار بار دہرا رہے تھے، جونہی کسی سڑک پر رش چھٹنے لگتا، اگلے ہی لمحے اشارہ بند ہونے سے گاڑیوں کا جم غفیر تیار ہو جاتا۔ ہوٹل تک کا مختصر سفر ایک گھنٹے میں طے کرتے ہوئے تین بجے ہم نے گاڑی ہوٹل کے سامنے پارک کی۔ ہوٹل پر لہراتے ہوئے انگلستان کے جھنڈے ہمیں ہماری دارلحکومت میں آمد پر مطلع کر رہے تھے۔ سفید رنگ کی عمارت جو اندر سے خوب مزین و آراستہ تھی۔ ہماری آج کی قیام گاہ تھی۔ ہم نے سامان گاڑی سے لیا اور ہوٹل کے استقبالیہ پر کھڑے میزبانوں کو اپنی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔ ہمارے کمرے کا نمبر ۴۰۳ تھا اور چوتھی منزل پر واقع تھا۔ دروازہ کھولنے کے لئے الیکٹرونک کارڈ لے کر ہم لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل پر پہنچے تو کمرے کے سامنے آتے ہی سکھ کا سانس لیا۔ ہوٹل انتظامیہ نے ہادی کے لئے بے بی کوٹ کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا، جس کا مطالبہ آصف نے بوقت بکنگ کیا تھا۔ مگر بیڈ کی لمبائی اور چوڑائی دیکھ کر آصف نے کوٹ واپس بھجوا دی، کیونکہ اس بیڈ پر با آسانی ہادی سو سکتا تھا۔ کمرے میں تمام ضرورت کی اشیا موجود تھیں۔ سردی کے پیشِ نظر کمرے میں ہیٹر چلائے گئے تھے، جنہوں نے

کمرے کوخوب گرم کر رکھا تھا۔ کمرے میں چائے بنانے کا سامان، پانی ابالنے کے لیے بجلی سے چلنے والی کیٹل، کپڑوں کی کشادہ الماری، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن غرضیکہ کئی سہولیات میسر تھیں۔آرام دہ کمرہ ملنے پر ہم نے تہہ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ سینڈوچز کھائے اور جی بھر کے تھکان اتاری۔ آصف تو ٹیلی ویژن پر چینل تبدیل کرتے رہے جبکہ ہادی ان کے پاس بیڈ پر اپنی کھلونا بس سے کھیلتا رہا۔ کچھ دیر تازہ دم ہونے کے بعد ہم لندن دیکھنے کے لئے گاڑی میں جا بیٹھے۔ ہماری خواہش تھی کہ اگلے روز مختصر وقت میں پاکستانی ہائی کمیشن کا کام مکمل کیا جائے تاکہ زیادہ وقت تفریح کے لئے بھی میسر آ سکے۔ پاکستانی ہائی کمیشن کے پوسٹ کوڈ کی تصدیق کرنے کے لیے navigation میں ڈالا جس نے ہوٹل سے ہائی کمیشن کی مسافت محض ۶ منٹ بتائی۔ہم نے رات کے اندھیرے میں ہائی کمیشن کی عمارت دیکھی اور پتہ صحیح ہونے پر دل کی ہمت بندھائی۔اسی لمحے آصف کو یاد آیا کہ انہیں پوسٹ آفس سے self-addressed envelope چاہیے تاکہ تجدیدِ میعاد کے بعد پاسپورٹ کے حصول کی خاطر دوبارہ لندن نہ آنا پڑے اور بذریعہ ڈاک پاسپورٹ ہمارے گھر پہنچ جائیں۔ یہاں بھی اللہ نے آسانی پیدا کی اور کچھ ہی دوری پر پوسٹ آفس مل گیا جو صبح ۹ بجے کھلتا تھا۔

کرسمس کے قریب ہونے کی وجہ سے لندن کو برقی قمقموں اور رنگ برنگے جلتے بجھتے ستاروں سے سجایا گیا تھا جس نے عمارتوں کے حُسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ گویا ہر عمارت تاروں سے سجی چادر اوڑھے ہر دیکھنے والے کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے فرائض پر معمور تھی۔ ٹریفک کا رش رات ہونے کے باوجود بدستور قائم تھا۔ کئی لوگ شاپنگ پلازوں کے باہر کھڑے ہو کر ان چمک دمک والی عمارتوں کی عکس بندی میں مصروف تھے۔ میں نے بھی کچھ نظارے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کیے۔ رفتہ رفتہ بھوک نے معدے میں انگڑائیاں لینی شروع کیں جس کی شدت سے بے تاب ہوکر ہم نے گاڑی ''لاہوری گیٹ ریستوران'' کی جانب موڑی جو ہماری قیام گاہ سے چند منٹ کی مسافت پر تھا۔ وہاں سے چاول، چکن جلفریزی اور روٹیاں لے کر ہوٹل کی جانب روانہ ہوئے۔

ٹریفک کے رش نے ہمیں کافی حد تک الرٹ کر دیا تھا۔اس لئے ہم اگلے روز صبح ۸ بجے ہی پاکستانی

ہائی کمیشن روانہ ہوگئے۔ وہاں کی formalities ختم ہوتے ہوتے گیارہ بج گئے اورہم نے گاڑی کا رخ پہلے بکنگھم پیلیس کی جانب موڑا۔

بکنگھم پیلیس:

یہ محل ملکہ برطانیہ الزبتھ کی رہائش گاہ ہے۔ ملکہ الزبتھ برطانیہ کی سربراہِ مملکت ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۲۶ء میں جارج ششم کے ہاں ہوئی اور انہوں نے ۲۵ برس کی عمر میں شاہی تاج اپنے سر پر رکھا۔ان کی شادی شہزادہ فلپ ڈیوک آف ایڈنبرا سے ہوئی جن سے ان کے چار بچے ہیں۔

بکنگھم پیلیس شاہی قیام گاہ ہونے کے باوجود سیاحوں کی آمدورفت کے لئے کھلا رہتا ہے۔محل میں ۷۷۵ کمرے ہیں جن میں اُنیس state rooms، ۵۲ شاہی مہمان خانے، ۱۸۸ عملے کی رہائش کے کمرے، ۹۲ دفاتر اور ۷۸ غسل خانے شامل ہیں۔عمارت کی لمبائی ۱۰۸ میٹر اور اونچائی ۲۴ میٹر ہے۔محل میں کئی شاہی تقریبات بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ یہ محل ۱۷۶۱ء میں شاہ جارج سوم نے اپنی بیوی ملکہ چارلوٹ کے اعزاز میں تعمیر کرایا جہاں اس کے ۱۴ بچوں کی پیدائش ہوئی۔۱۷۶۲ء میں شاہی ضروریات کے اضافے کے تحت ۷۳۰۰۰ ڈالر کی لاگت سے محل کی تعمیرِ نو کروائی گئی۔آج کل یہ محل موجوہ ملکہ الزبتھ اور اس کے شاہی خاندان کے زیرِ استعمال ہے۔محل کے دربار، کمرہ تاج پوشی اور دیگر مہمان خانے تزئین وآرائش کے بے مثل نمونے ہیں جن کو دیکھ کر پرستان کا گمان ہوتا ہے۔محل کے باہر شاہی گھڑ سوار نگرانی پر مامور ہوتے ہیں جو دو دو تین تین کی ٹولیوں میں گزرتے ہیں اور سیاحوں کو محظوظ کرتے ہیں۔

بکنگھم پیلیس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے مادام تساؤ کے عجائب گھر جانے کا ارادہ کیا۔

مادام تساؤ کا عجائب گھر:

اس عجائب گھر کی تاریخ کافی دلچسپ ہے۔سب سے پہلے ۱۷۷۰ء میں پیرس میں لوگوں کی شبیہات رکھنے والے مجسمے ڈاکٹر فلپ کرئیس نے بنائے جن کو خوب پذیرائی ملی۔ انیسویں صدی میں یہ ہنر برطانیہ پہنچا۔ وہ خاص معروف شخصیات جن کے بارے میں کوئی عام انسان اخباروں میں پڑھتا ہے اور زندگی بھر ان سے ملاقات نہیں کر پاتا، یہاں ان کے ہو بہو مجسموں سے مل سکتا ہے، یہ انسانی مجسمے اصلی شخصیت سے

اتنی مماثلت رکھتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے۔۱۸۳۵ء میں مجسموں کی یہ نمائش لندن کی بیکر اسٹریٹ میں لگتی تھی جہاں لوگ ۶ پنیس کے عوض اپنی پسندیدہ شخصیات کے مجسموں سے ملتے تھے۔۱۸۸۴ء میں مادام تساؤ میوزیم کو موجودہ مار یلبون روڈ لندن منتقل کر دیا گیا۔

تقریباً ۲ بجے دوپہر ہم نے مادام تساؤ کے سامنے گاڑی پارک کی۔ سبز اور سرخ رنگ کی عمارت پر انگلستان کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی کھایا پیا اور تازہ دم ہو کر پونے تین بجے مادام تساؤ پہنچے۔ ہماری ٹکٹ تین بجے کی تھی مگر انہوں نے ہمیں اندر جانے کی فوراً ہی اجازت دے دی۔ سامنے کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون نے ہمیں ہادی کی پرام قریبی ہال میں چھوڑنے کو کہا کیونکہ اندر پرام کے گھومنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم نے بھی دیگر سیاحوں کی طرح پرام قریبی کمرے کے سامنے کھڑی خاتون کے حوالے کی جس نے بتایا کہ ہم واپسی پر اسے یہیں سے لے سکتے ہیں۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہی پسِ منظر میں اعلانات گونجنے لگے۔'' Yor are now going to arrive on the red carpet'' لفٹ کا دروازہ کھلتے ہیں سامنے زمین پر روشنی کے گول دائرے دائیں بائیں رقص کرنے لگے۔ یہ خوش آمدید کا انداز انتہائی دلکش وسحر انگیز تھا۔ ہادی بھی ان دائروں کو دیکھ کر خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہم قریبی ہال میں داخل ہوئے تو ہر مجسمہ کے پاس شائقین کا ہجوم کھڑا تصویر کشی میں مصروف تھا۔ ہم تو صرف چند مجسموں کو ہی پہچان پا رہے تھے۔

سب سے پہلا مجسمہ جو جانا پہنچانا لگا وہ سینتا کلاز کا تھا۔ سینتا ہاتھوں میں گفٹ پکڑے آرام دہ صوفے پر بیٹھا تھا جبکہ قریب ہی کئی اور گفٹ باکس پڑے تھے۔ باقی مجسمے برطانوی اداکاروں کے تھے جن کے بارے میں ہم قطعاً لاعلم تھے۔ اگلے ہال میں بھارت کے فلمی اداکاروں کے مجسمے رکھے گئے تھے۔ وہاں سے آگے چلے تو نامور کھلاڑیوں کے مجسمے بھی موجود تھے جن میں بشمول دیگر امریکی نژاد باکسر محمد علی اور بھارتی بلے باز سچن ٹنڈولکر کا مجسمہ تھا۔ یہ سب انسانی مجسمے حقیقی انسان معلوم ہو رہے تھے۔ کئی جگہ کھڑے انسانوں پر ہی مجسمہ کا شائبہ ہونے لگتا۔ اگلے ہال میں شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کے مجسمے جن میں اسٹیج پر ملکہ الزبتھ، شہزادہ ولیم اور شہزادی کیٹ مڈلٹن موجود تھے۔ اگلے ہال میں بائیں جانب انگریز گلوکاروں کے مجسمے تھے جن میں مائیکل جیکسن اور لیڈی گاگا بھی شامل

تھے۔ دائیں جانب سیاسی شخصیات کے مجسمے تھے، مثلاً باراک اوباما، ڈیوڈ کیمرون، نیلسن منڈیلا، مارٹن لوتھر کنگ، گاندھی، ٹونی بلیئر اور بے نظیر بھٹو، ایک جانب البرٹ آئنسٹائن بھی موجود تھا۔ گویا ہر جانب مجسمے تھے اور ان کے گرد انسانوں کا ایک رش۔ جب ہم نے سارے مجسمے دیکھ لئے تو باہر نکلنے کے لئے راستہ تلاش کرنے لگے۔ خیال آیا کہ شاید جس لفٹ سے آئے تھے اسی راستے سے واپسی کا راستہ نکلتا ہو۔ یہی سوچ کر واپس چلے گئے مگر جب بھی کسی انتظامیہ کے بندے سے پوچھتے تو واپس وہ ہمیں انہیں کمروں میں بھیج دیتا جہاں سے ہم آئے تھے۔ غرضیکہ ہم دوبارہ سے سیاستدانوں کے مجسموں والے کمرے میں جا پہنچے۔ وہاں ایک تنگ راستہ آگے کو جاتے ہوئے دیکھ کر ہم نے شکر ادا کیا کہ باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔ مگر راستوں کے پیچ وخم سے ہوتے ہوئے ہم tourist train تک جا پہنچے۔ ہم ٹرین پر بیٹھے تو وہ خود کار نظام کے تحت چلنے لگی اور اعلانات ہونے لگے کہ ہم اب چار سو سال قدیم برطانیہ کی سیر کریں گے۔ یعنی ابھی سفر جاری تھا۔ وہ گاڑی ہمیں لے کر اس قدیم دنیا میں گھومتی رہی اور پسِ منظر میں قدیم تہذیب کی داستان سنائی جاتی رہی۔ یہاں دیواروں پر لگے مجسمے ہلتے جلتے اور کئی مجسمے مشینیں چلاتے رہے۔

''یا اللہ! یہ سب کیسے ہو رہا ہے؟''

کوئی مجسمہ ہاتھ ہلا رہا ہے تو کوئی آنکھیں گھما رہا ہے۔ خیر برطانوی قدیم تہذیب کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم گاڑیوں سے اترے تو سیڑھیاں ہمیں بھوت بنگلے نما کمرے میں لے گئیں۔ یہاں کی دیواروں اور چھتوں پر چمگادڑوں کی بنی ہوئی تصاویر تاریک کمرے میں چمک رہی تھیں جبکہ پیچھے ہولناک قسم کی موسیقی چل رہی تھی۔ ہمارے خیال کے برعکس ہادی بہادری سے وہاں سے ہمارے ساتھ گزرتا رہا۔ آگے چل کر ماحول مزید بھیانک ہوگیا جب وہاں موجود مجسمے خوفناک ہوتے گئے۔ دل کرتا تھا کہ جلد از جلد اس بھیانک تاریک غار سے باہر نکل جائیں مگر آصف تو گویا اس خوفناک ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور مجھے بھی سب کچھ دیکھنے پر اور انجوائے کرنے کو کہہ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ہم وہاں سے نکلے تو سامنے اسٹاف نے ہمیں چھوٹے بچے کے ساتھ دیکھ کر کم بھیانک حصے سے گزرنے کا مشورہ دیا۔ آصف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کو زیادہ خوفناک علاقے میں جانے دیا جائے۔

☆☆☆

مگرانہوں نے مجبوراً میرے اور ہادی کی وجہ سے ارادہ تبدیل کر دیا۔ آگے ایک عورت کا مجسمہ تھا جو لیٹی ہوئی تھی اور سانس لے رہی تھی۔ جب یہاں سے نکلے تو ہمیں خاص قسم کی عینکیں پہنا دی گئیں اور ہمیں بتایا گیا کہ اب ہم سینما ہال میں جا رہے ہیں۔ جہاں کارٹون کرداروں پر ایک فلم دکھائی جائے گی جس کا دورانیہ دس منٹ ہوگا۔ ہم آخر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ فلم تھی کہ ناقابل یقین جادوگری تھی۔ سکرین پر شیشے ٹوٹتے تو اس کی کرچیاں ہم پر گرتی ہوئی محسوس ہوتیں اور پانی کے چھینٹے ہم پر گرنے لگتے۔ سکرین پر ہوا چلتی تو ہمارے چہروں پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پڑنے لگتے۔ اگر کوئی کردار زور سے چلتا تو سینما ہال کی زمین تھرتھرانے لگتی۔ یہاں سے اس ناقابلِ فراموش تفریح کی باتیں کرتے ہوئے ہم گاڑی کی جانب روانہ ہوئے۔ آصف کہنے لگے۔

''جس نے لندن میں مادام تساؤ نہیں دیکھا اس نے لندن نہیں دیکھا''

بکنگھم پیلیس اور مادام تساؤ میں گزارے پل ہماری یادوں کا ایک ناقابل فراموش باب بن چکے ہیں۔

ڈرائی پورٹ

جب ریٹائر ہوئی تو پتہ چلا کہ بہت سے سال ایسے گزرے جن میں میں نے ضرورت سے زیادہ ٹیکس کٹوا دیا ہے اور اب ہزاروں کے حساب سے میرے پیسے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کی طرف رہتے ہیں۔ بہت سے خط لکھے بہت سی سفارشیں کروائیں مگر وہ پیسے واپس نہ ملے۔

ادھر صائم بیٹے نے دھڑا دھڑ فون کرنے شروع کر دیے کہ اب تو آپ ریٹائر ہیں اب امریکہ ہمارے پاس آنے میں کیا عذر ہے۔ آخر جانے کا فیصلہ کرلیا اور امریکہ چلی گئی۔

کھلے گھروں سے تنگ فلیٹوں میں رہنا پڑا تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ہر وقت یہی دل چاہتا کہ دروازہ کھولوں تو سامنے ٹیرس ہو اور اوپر آسمان نظر آئے۔ روٹین کچھ اس طرح تھی کہ صبح سات بجے صائم تو ناشتہ کر کے ہسپتال چلا جاتا، میں اور سبات گھر کے کاموں میں لگ جاتے۔ بہت جلد میں نے پاکستانی لوگوں کے ساتھ جو قریب ہی رہتے تھے دوستی کر لی اور کچھ کچھ دل لگ گیا۔

ایک دن صائم ہسپتال سے واپس آیا تو ہاتھ میں بہت سے لفافے تھے۔ وہ قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا اور خط کھول کر پڑھنے لگا۔ ایک خط وہ بہت دھیان سے پڑھ رہا تھا۔

''کس کا خط ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں یہ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے آیا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے کچھ ہزار ڈالرز زیادہ جمع کروا دیئے ہیں۔''

''اف تو یہ وہی مصیبت تم پر بھی آ گئی ہے؟ جو کلپائی میں پاکستان کر کے آئی ہوں۔ وہ یہاں تمھیں بھی مل گئی ہے۔''

''کلپائی! کیا مطلب ہے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں نے کافی ہزار فالتو ٹیکس دیا تھا جو کافی خطوں اور سفارشوں کے بعد بھی نہیں ملا اور میں یہاں آ گئی ہوں۔''

''نہیں یہاں وہ حساب نہیں ہوتا جو پاکستان میں ہوتا ہے۔ میں انھیں خط لکھوں گا تو وہ مجھے چیک بھجوادیں گے۔''

''ایک ہی خط سے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی ایک ہی خط سے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''چلو میرے سامنے لکھو میں دیکھتی ہوں کہ چیک آتا ہے یا نہیں۔''

اس نے میرے سامنے خط لکھا۔ لفافے میں ڈالا اوپر ایڈریس لکھا اور کہا ''کل ہسپتال جاتے ہوئے پوسٹ کردوں گا۔''

اگلے دن وہ آیا میں نے جھٹ پوچھا۔ ''خط پوسٹ کردیا تھا؟''

''جی امی'' جواب ملا۔

پانچ چھ دنوں کے بعد ہم لوگ بازار سے واپس آ رہے تھے۔ مین گیٹ پر تمام فلیٹس والوں کے لیٹر بکس تھے۔ صائم نے عادت کے مطابق اپنا کھول کر دیکھا۔ تین چار لفافے تھے ہم لوگ اپنے فلیٹ میں آ گئے۔ جو چیزیں خریدی تھیں وہ نکال نکال کر ٹھکانوں پر لگانے لگے۔ صائم لفافے کھولنے لگا۔ بے ساختہ صائم کی ہنسی کی آواز آئی۔

''امی ادھر آئیں آپ خوش ہو جائیں گی یہ لیجیے چیک دیکھئے آ گیا ہے جتنے زیادہ ڈالرز میں نے جمع کروائے تھے وہ واپس آ گئے ہیں۔''

بجائے اس کے کہ میں خوش ہوتی میں زیادہ غمزدہ ہوگئی کہ یہ صفتیں تو ہم مسلمانوں کی تھیں جو کافروں نے اپنالی ہیں۔

وقت گزرتا گیا۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے صائم کو بیٹا دیا پھر کچھ سال بعد بیٹی۔ جب تک تو بیٹا تھا ہم لوگ زیادہ پریشان نہ ہوئے مگر جب بیٹی ہوئی تو ایک دم یہ خیال آنے لگا کہ لڑکی کے لیے تو یہ ماحول ٹھیک نہیں۔ ہر سال جب صائم بمعہ فیملی کے پاکستان آتے تو تمام خاندان ایک ہی بات کرتا کہ لڑکی کو کسی آزمائش میں نہ ڈال دینا پاکستان واپس آؤ۔ آخر جب نور پانچ سال کی ہوئی تو ایک دن صائم نے اطلاع دی کہ وہ لوگ مستقل طور پر پاکستان آ رہے ہیں اور آنے سے پہلے ایک عدد کنٹینر کروا کر گھر کا سامان اور کچھ اور چیزیں لے کر آئیں گے۔ کنٹینر کیونکہ بحری جہاز سے آئے گا اسے مہینہ لگ جائے گا۔ پہلے وہ کراچی آئے گا پھر کمپنی والے اسے کراچی سے لاہور بھجوا دیں

گے۔

مئی میں یہ لوگ آ گئے۔ کنٹینر کو جون میں پہنچنا تھا۔ انٹرنیٹ کے ذریعے صائم کو پل پل کی اطلاع مل رہی تھی۔ بیس بائیس دنوں میں کنٹینر کراچی پہنچ گیا۔ کراچی والوں نے کافی پٹایا۔ انھوں نے کہا کہ لاہور جاتے ہوئے کنٹینر Damage ہوسکتا ہے اس لیے آپ فوراً ستر ہزار روپے سیکیورٹی online ہمیں بھجوائیں۔ صائم نے انھیں کافی سمجھانے کی کوشش کی کہ اس نے کمپنی کو لاہور تک کا کرایہ دے دیا تھا۔ جواب ملا اگر آپ شام تک ستر ہزار روپے نہیں بھیجیں گے تو کل سے پچاس ہزار روپے یومیہ کے حساب سے جرمانہ شروع ہو جائے گا۔ میں نے صائم کو سمجھایا کہ یہ پاکستان ہے یہاں دو چیزیں ہی کام کرتی ہیں پیسہ یا سفارش۔ تم ستر ہزار تو ابھی بھیج دو بعد میں دیکھ لیں گے۔ چنانچہ ستر ہزار روپے اسی وقت بھیج دیے گئے۔

صائم سخت ناراض تھا۔

''ابھی تو لاہور پہنچنے پر دیکھنا تمھارا کیا حال ہوتا ہے۔'' میں نے اسے کافی سمجھانے کی کوشش کی کیونکہ اس سے پہلے میرا بھانجا امریکہ سے یہاں شفٹ ہوا تھا۔ ڈیڑھ دو لاکھ تو کراچی والوں نے جرمانہ کیا اس کے بعد لاہور بھی اس کی خوب درگت بنی۔ اگلے دن ہی ایک آدمی کا فون آیا۔

''ڈاکٹر صائم سے بات کرنی ہے۔'' فون میں نے ہی اٹھایا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ ڈرائی پورٹ سے فون کر رہا ہے۔''

''وہ تو گھر نہیں آپ پیغام دے دیں۔'' میں نے کہا۔

''ان کا کنٹینر تین دن تک پہنچ رہا ہے اُن سے کہیں مجھ سے بات کریں۔''

دل میں سوچا یہ کوئی کلرک ہی ہوگا جو رشوت چاہتا ہے۔ صائم آیا تو اسے بتایا۔ کہنے لگا۔

''میں نے رشوت کا ایک دھیلہ نہیں دینا۔'' وہ کراچی والی بات پر ہی تپا ہوا تھا۔

''تو پھر کوئی سفارش ڈھونڈو۔'' میں نے کہا۔

کچھ عرصہ پہلے میری بہن دبئی سے لاہور شفٹ ہوئی تو ان کی ذاتی مرسڈیز گاڑی جو وہ استعمال کرتے تھے آتے ہوئے لیتے آئے۔ ڈرائی پورٹ والوں نے اتنی ڈیوٹی لگائی جتنی میں انھوں نے

خریدی بھی نہ تھی۔ میرے بہنوئی نے ضد باندھی کہ میں رشوت نہیں دوں گا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ڈرائی پورٹ پر ہی پڑی پڑی پہلے ٹکڑے ٹکڑے ہوئی پھر ٹکڑے بھی غائب ہو گئے۔اس آدمی کا دن میں تین چار مرتبہ فون آتا آخر میں تو اس نے گول مول لفظوں میں یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ چالیس پچاس ہزار میں کام بن جائے گا۔آپ مجھ سے مل تو لیں۔

صائم پر امید تھا کہ اس کا زیادہ سامان استعمال شدہ ہے اسے زیادہ ڈیوٹی نہیں لگے گی اس لیے رشوت نہیں دینی۔

دو دن گزر گئے۔تیسرے دن آفس سے فون آیا کہ کنٹینر لاہور ڈرائی پورٹ پر پہنچ گیا ہے۔ اس دوران صائم نے اپنے خالو سے جو سول سروسز اکیڈمی کے ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے ہیں بات کی۔انھوں نے اکیڈمی کے کسی ڈپٹی ڈائریکٹر کی ڈیوٹی لگا دی۔انھوں نے تسلی دے دی کہ ان کی کلکٹر سے بات ہوگئی ہے۔ صائم تسلی سے صبح ہی تیار ہو کر چلا گیا۔شام کو جب واپس آیا تو اس طرح نڈھال تھا جیسے کئی ماہ سے بیمار ہے۔

''کیا بات ہے؟''میں نے پوچھا۔

''آپ مجھے کہتی ہیں پاکستان آ جاؤ بے ایمان حکمرانوں نے اس ملک کو اس قابل چھوڑا ہے کہ ہم لوگ آرام کی زندگی چھوڑ کر یہاں آ کر خوار ہوں؟'' اس نے غصے سے کہا۔میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پندرہ سال بعد جون کا مہینہ اس پر آیا تھا،ساتھ لوڈ شیڈنگ۔ہم تو کافی حد تک اس کے عادی ہو گئے تھے مگر اس کا تو برا حال تھا۔ میں نے نمک ڈال کر سکنجبین بنائی اور جگ ہی اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وضو کر کے میں مغرب کی اذان کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بجلی آ گئی اس نے اے سی لگایا اور لیٹ گیا۔میں تو اذان ہونے پر نماز پڑھنے لگی، یہ اٹھ کر نہانے چلا گیا پھر آ کر نماز پڑھ کر پھر لیٹ گیا۔ میں نے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔رات کھانے کے بعد اس نے خود بات شروع کی۔

''رات دو بجے سامان گھر پہنچے گا میں نے بڑا ٹرالا کروا لیا تھا۔مزدور بھی سات آٹھ انگیج کر لیے تھے۔''

اب میں نے پوچھا''کام آسانی سے ہو گیا تھا؟''

''آج آپ کا بیٹا heat stroke سے مر بھی سکتا

تھا۔''

''کیوں؟''میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''جب میں یہاں سے ڈرائی پورٹ پہنچا تو سفارش کے باوجود کوئی میری طرف توجہ نہیں کر رہا تھا۔ میں نے خالو جان کو فون پر بتایا انھوں نے غالباً سول سروسز اکیڈمی فون کیا۔تھوڑی دیر کے بعد مجھے بلایا گیا اور کہا گیا کہ اس آدمی کے ساتھ جائیں اور کنٹینر کھلوا کر سامان چیک کروائیں۔

''ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کو اتنا فون کیا تھا آپ ملے ہی نہیں''اس آدمی نے گول مول بات کی مجھے پتہ چل گیا کہ یہ وہی آدمی ہے میں چپ رہا۔ کنٹینر کے پاس کچھ مزدور ٹائپ کے لوگ کھڑے تھے۔اس نے اشارہ کیا انھوں نے تمام ڈبے نکال کر زمین پر رکھ دیے تو اس نے مزدوروں کو کہا''میں اندر کسی کام سے جا رہا ہوں تم کھانا کھا آؤ۔''اور بغیر مجھ سے بات کیے چلا گیا۔ مزدور بھی چلے گئے میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ حالات یہ کہ تمام ڈبے کھلے،سر پر سورج ،میں سائے میں بھی نہیں جا سکتا تھا کہ سامان کھلا تھا۔

گھنٹہ گزرا اب مجھے شدید سر میں درد اور ساتھ ہی الٹیاں شروع ہو گئیں۔ پاس کوئی کینٹین بھی نہیں تھی کہ کوئی جوس ہی خرید کر پی لیتا۔ بار بار خیال آتا کہ میں پاکستان کیوں آیا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اب بچ نہیں سکتا۔

اللہ کو مجھ پر رحم آیا۔ایک جوان لڑکا آیا۔''آپ ڈاکٹر صائم ہیں؟''اس نے مجھ سے پوچھا۔''میں سول اکیڈمی سے آیا ہوں ابھی سامان چیک نہیں ہوا؟''

میری حالت دیکھ کر وہ فوراً اندر گیا تھوڑی دیر بعد ہی وہ شیطان آدمی مسکراتا ہوا اس کے ساتھ آیا۔

''میں اصل میں مصروف ہو گیا تھا۔''

وہ بالکل جھوٹ بول رہا تھا وہ مجھے سزا دے رہا تھا کہ میں اس سے کیوں نہ ملا۔''آپ جائیں میں چیک کر لیتا ہوں''اس نے اس نوجوان سے کہا۔ وہ ہاتھ ملا کر چلا گیا وہ مزدور بھی آ گئے۔ہم نے ہر ڈبے کے باہر پیٹرول مار کر سے لکھا ہوا تھا کہ اس کے اندر کیا ہے اور اُن کے اوپر نمبرنگ بھی کی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب آپ نے تو بہت میتھوڈیکلی لکھا ہے چلیے پہلے نمبر ایک ڈبہ کھولتے ہیں۔'' پہلے اس نے باہر سے پڑھا چھریاں، چمچے، کانٹے، کچن کی چیزیں،اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔''آپ بتا سکتے

ہیں کہ کتنے کانٹے اور کتنی چھریاں ہیں؟''

''مجھے نہیں پتہ یہ ڈبہ میری بیوی نے بند کیا تھا جو کچھ کچن میں استعمال ہوتا ہوگا وہی ہوگا۔ عورتوں کو تو ویسے ہی گھر کی چیزیں اچھی لگتی ہیں میں نے تو بہت کہا تھا کہ پھینک دو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''چلیے پھر بارہ بارہ لکھ لیتے ہیں اور باقی چیزیں بھی اندازے سے لکھ لیتے ہیں۔'' اس کے پاس فائل تھی اس نے اس میں کچھ لکھا۔

''جو مرضی لکھ لیں استعمال شدہ چیزیں ہیں ایک بات میں بتا دوں کہ ہم پاکستان پکے آ رہے ہیں اس صورت میں گھر کی استعمال شدہ چیزوں پر ڈیوٹی نہیں لگنی چاہیے۔''

''نہیں یہ بات نہیں آپ کے پاسپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کئی مرتبہ آئے بھی ہیں اور بہت دیر رہ کر واپس چلے بھی گئے ہیں، یہ رول یہاں نہیں لگے گا۔ ہوسکتا ہے آپ بزنس کے سلسلے میں آئے ہوں۔ یہ اتنے سارے ڈبے ہیں ابھی پتہ چلے گا کیا کیا ہے۔''

وہ چبا چبا کر بول رہا تھا ہر لفظ سے لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہے اب پکڑے تو گئے ہو دیکھتے ہیں کیسے چھٹتے ہو۔

''نمبر دو ڈبے میں کیا ہے؟'' وہ جھکا۔ ''اوہ جوتے یہ تو تمام نکال کر دیکھنے پڑیں گے کہ لیدر کے کتنے ہیں اور ریکسین کے کتنے۔ لیدر کے جوتے تو قیمتی ہوتے ہیں ان پر تو ڈیوٹی لگے گی۔''

اس نے ایک مزدور کو اشارہ کیا اس نے ڈبے میں سے تمام جوتے نکال کر زمین پر ڈھیر لگا دیا۔ زیادہ تو بچوں کے استعمال شدہ چھوٹے جوتے تھے۔ کچھ میرے اور سبات کے وہ جوتے تھے جو ہم لوگ استعمال کر رہے تھے۔ کچھ نئے بھی تھے۔ سبات کی فطرت میں صفائی پسندی بہت ہے۔ اس نے پرانے جوتے بھی اس طرح چمکا چمکا کر ڈبوں میں ترتیب سے رکھے ہوئے تھے کہ وہ بھی نئے ہی لگ رہے تھے۔ جس وقت وہ یہ ڈبہ بنا رہی تھی میں نے بہت کہا تھا انھیں پھینک دو اس نے جواب دیا جبکہ کنٹینر کی پوری قیمت دے رہے ہیں جگہ بھی ہے تو لے چلتے ہیں کسی نہ کسی بچے کو تو پورے آ ہی جائیں گے۔''

اس نے فائل میں کچھ لکھا پھر تیسرے ڈبے کی طرف گیا۔ ''اس کی ساری چیزیں باہر نکالو۔ اوہو یہ تو واکر اور ٹرائی سائیکل بھی ہے اور ڈھیر سارے

کھلونے، یہ تو بہت خوبصورت چیزیں ہیں۔'' اس آدمی کی حرکتوں اور باتوں سے میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''آپ یہ لے لیں میرے بچے تو اب بڑے ہو گئے ہیں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔ ایک ڈبے میں لکڑی کا صوفہ کم بیڈ کا فریم تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' غالباً اسے سمجھ نہیں آئی۔

''یہ صوفہ کم بیڈ کا فریم ہے۔'' میں نے بیزار ہو کر جواب دیا۔

''اس پر آپ گدا ڈالتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر تو یہ صوفہ ہی ہوا۔ صوفے پر تو ڈیوٹی لگائی جاتی ہے۔''

''اسے ہم سات سال سے استعمال کر رہے ہیں۔''

''پھر بھی ہے تو صوفہ'' اور اس نے فائل میں کچھ لکھ دیا۔

اسی طرح ہر ڈبے پر اس نے کوئی نہ کوئی مسئلہ پیش کر دیا۔ صائم کے مطابق سب سے زیادہ بحث Sony کے ٹی وی پر ہوئی۔ وہ اصرار کر رہا تھا یہ جاپانی ہے، صائم کہہ رہا تھا یہ ملائیشیا کا بنا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ پورا باہر نکالا گیا وہ ملائیشیا ہی کا تھا۔ جاپانی ٹی وی پر بہت زیادہ ڈیوٹی لگتی تھی۔ اسی طرح شام ہو گئی۔

آخر کار وہ کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب چالیس پچاس ہزار میں کام ہو جانا تھا، یہ لیں ڈھائی لاکھ ڈیوٹی لگی ہے کیش یا پے آرڈر بنوا کر جمع کروا دیں۔'' وہ کاغذ دے کر چلا گیا۔ صائم نے تمام ڈبے انہی مزدوروں سے بند کروا کر وہیں سے ٹرالا لے کر رکھوائے، تالا لگایا اور گھر آ گیا۔

آخری فیصلہ جو ہوا وہ یہ ہے کہ سبات اور بچے پاکستان رہیں گے اور صائم امریکہ ہی میں نوکری کرے گا اور سال میں ایک دو مرتبہ آ جایا کرے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

یہ روز و شب!

کاش معاشرے کی اصلاح کے دعوے دار خود کو بھی معاشرے کا حصہ سمجھیں!

اس کائناتِ ارض وسما کی سب سے قیمتی، حسین، قابل تخلیق انسان ہے، انسان کو خود بھی علم نہیں کہ وہ کتنی اعلیٰ وارفع مخلوق ہے۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ خود انسان کو معلوم نہ ہو کہ وہ کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔

دنیا میں انسان نے اپنی کیا قیمت لگائی ہے؟ کسی چیز، کس کام، کس مقصد کو اپنی زندگی، اپنی شخصیت سے زیادہ قیمتی جانا ہے؟

زندگی کیا ہے؟ ماہ وسال، شب وروز کا گزرتے جانا زندگی ہے۔ یہی انسان کا سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ سے وہ کیا خرید رہا ہے؟ ہر لمحہ ہر ساعت کرنسی کا ایک نوٹ ہے۔ ہر سانس ایک سکہّ ہے۔ یہ کرنسی یہ سرمایہ خرچ ہو رہا ہے۔ اس کے بدلے وہ کیا خرید رہا ہے؟

ہر صبح، ہر انسان چاہے وہ بادشاہ ہو یا فقیر چوبیس گھنٹے کی کرنسی جیب میں لے کر اٹھتا ہے۔ کتنا بدنصیب ہے وہ انسان جو روزانہ اس سرمایہ کو ضائع کر دیتا ہے۔ خالقِ انسان نے کسی کو بھی یہ سرمایہ ایک ہی بار عطا نہیں کیا کہ وہ کتنا لمبا عرصہ اس سرمایہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جانے کب سرمایہ ختم ہو جائے۔ عقل مند ہے وہ جو اپنی جان کو کسی بہت زیادہ قیمتی شے کے بدلے بیچ دیتا ہے۔ مگر وہ عقل مند کہاں ہیں جو ہر سانس، ہر ساعت، ہر لمحہ اپنی بیش بہا زندگی سے ابدی راحتوں کا سامان کرنا چاہتے ہوں۔

انسان کے میدانِ عمل مختلف ہیں۔ ہر عمل کے بدلے وہ کچھ نہ کچھ حاصل کرتا ہے۔ مزدور اپنی محنت کا پھل پاتا ہے۔ افسر اپنے اس سرمائے کا پھل پاتا ہے جو اس نے افسرانہ شان کو حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا۔ اپنی زندگی کے بہترین شب وروز ڈگری کے لیے وقف کر دیئے، جو کوشش کرے گا، ویسا ہی پھل پائے گا۔

ہر ورز صبح کو آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس وقت اعلان کرتا ہے کہ ''اگر آج کوئی بھلائی کر سکتا ہے تو کر لے کیونکہ آج کے بعد میں پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔'' (صحیح ابن جہان۔3388)

رات کے بعد ہر نئی صبح ہر انسان کو مسکرا کر کہتی

ہے ''میں آج پہلی اور آخری بار لائی گئی ہوں۔ نہ اس سے پہلے میرا ظہور ہوا نہ آئندہ ہوگا۔ مبارک ہو، آج کے لیے سرمایہ مل گیا، جو تم کاروبار میں لگاؤ گے۔''

انسان دن بھر کے پیش آمدہ مسائل کو سوچتا ہے اور رنجیدہ ہوتا ہے۔ صبح کا استقبال نئی امید، نئے ولولہ سے نہیں کرتا۔ حالانکہ آج کا نیا دن نیکی میں سبقت لے جانے کی دعوت دیتا ہے۔ گزشتہ کل کی نادانیوں کی تلافی کا موقع دیتا ہے۔ کاروبارِ عمل میں بہتر فیصلوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ کل جو سرمایہ ضائع ہوا اس کی تلافی کے لیے سوچ عطا کرتا ہے۔ اپنی عمر کی کرنسی کی کساد بازاری کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جسم و جاں جس کا کوئی نعم البدل نہیں دنیا میں کن حسرتوں کے بدلے گھل رہی ہے؟ راتیں کن مشاغل میں گزر رہی ہیں؟ دن کن مصروفیات میں سفر طے کر رہا ہے؟ پیٹ میں کیا جا رہا ہے؟ دماغ میں کیا منصوبے بن رہے ہیں؟ دل کی بستی میں کون سے آسیب ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں؟ آنکھوں کی بصیرت کہاں جا سوئی ہے؟ انسانی زندگی، درندوں سے بدتر کیوں ہوتی جا رہی ہے؟

دوسرے کے بارے میں جو خیالات ہیں اس آئینے میں اپنی شکل نظر نہیں آتی۔ نصیحت کی ضرورت دوسروں کو ہے۔ لوگ ایماندار ہو جائیں۔ لوگ صابر وشاکر ہو جائیں، لوگ خدا خوفی اختیار کریں، اپنا آپ پہچان لیں، دوسرے اپنا احتساب کر لیں۔ لوگ خود کو بدل لیں جب بھی یہ کوئی بولتا ہے خود کو اونچے سٹیج پر کھڑا کر لیتا ہے۔ سامنے عوام الناس کے حصے میں ''کر لینا چاہیے، ہو جانا چاہیے، کر لیا جائے، ہو جائیں،'' کی تکرار آتی ہے۔

کاش! دوسروں کو بہترین انسان دیکھنے والے خود کو بھی انسان کے روپ میں دیکھیں اور بہتری کی کوئی کوشش کریں۔ معاشرے کی اصلاح کے دعوے دار خود کو بھی معاشرے کا حصہ سمجھیں۔ مصلح کی نظر اپنی اصلاح پر بھی ہو۔ عوام الناس کی محرومیوں اور دکھوں کا بھی کوئی چارہ گر ہو!!!

اونچے ایوانوں میں بیٹھے منتخب نمائندے ہوں یا حکمران، فقیہہ شہر ہوں یا صوفی، گدی نشین ہوں یا تخت نشین، سب کی ضرورت ہے..... بے بس، مجبور، مظلوم، خود سے نا آشنا عوام کا جم غفیر..... جس کا وہ اونچے سٹیج پر بیٹھ کر تماشا دیکھ سکیں۔ عوام کو ''اہل نظر'' نہیں ملتے کہ نمائندوں کو منتخب کریں جواباً منتخب ہو کر انکو عوام ''نظر'' نہیں آتے۔ انسان کو علم ہی نہیں کہ اس

کی دنیا میں کیا قدر قیمت ہے؟ دونوں طبقوں میں ''نظر '' کا مسئلہ ہے۔ نہ جانے کب کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد!

آیئے آج صبح کی مسکراہٹ کا جواب آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر دیں۔آئینہ سب کی شہادت بھی دیتا ہے، راز داری بھی رکھتا ہے۔اپنے اپنے آئینے میں نظر ڈالیں۔کسی اور مصلح کے بغیر.....خاموشی سے، دھیان سے ،بس''صاحب نظر'' کی بات پہ کان دھریں جو خیرخواہی سے مجھے دیکھ رہا ہے۔آپ کو دیکھ رہا ہے آپ کا خیرخواہ..... میں اور آپ ہی کیوں نہ ہوجائیں تازہ بستیاں آباد کرنے میں پہل کرنے والے اہلِ نظر.....!

☆☆☆

آہ یہ جدائی!

ماحول بے انتہا سوگوار تھا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ حباء کے ساتھ ہونے والا سانحہ اور پھر اس کا ہمیشہ کے لیے روٹھ جانا کسی صدمہِ عظیم سے کم نہ تھا۔

حباء ہر دل کی دھڑکن اپنے ساتھ والدین، بہن، بھائیوں کے دل کی خوشی ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کی وفات کی خبر بجلی بن کر گری تھی۔ کوئی دل ماننے کو تیار نہ تھا۔ پرنم آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے نظریں چرائی جارہی تھیں۔ میری نگاہیں اس چہرے سے نہ ہٹ رہی تھیں جس کو میں نے بارہا چوما تھا۔ پیار کیا تھا۔ آج وہ ہمیشہ کے سفر پر روانہ ہورہی تھی..... بے انتہا پرسکون، الوہی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ لیے۔ اس کے اردگرد ہجوم سسک رہا تھا اور وہ سوگواران کے مجمع میں اتنی پرسکون تھی کہ ایسا لگ رہا تھا یہ ابھی سوتے سے اٹھ جائے گی۔ وہ ہر تکلیف، ہر غم، ہر پریشانی سے بے نیاز ہوچکی تھی۔ اللہ اسے روزِ محشر تک اسی طرح پرسکون نیند عطا کرے، اس کی قبر ٹھنڈی رکھے، اس میں جنت کی تازہ ہوا آتی رہے اور حباء کا ایسا استقبال ہو جس کے متعلق خود خالق کائنات نے سورۃ الفجر میں فرمایا ہے اے نفس مطمئنہ! چل اپنے رب کی طرف.....!

آہ آج وہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں جن میں محبت کی چمک ہوتی تھی۔ وہ زبان خاموش تھی جس سے وہ اپنا خلوص، اور ہر کام کے لیے اپنی خدمات کو پیش کرتی تھی۔ وہ ہاتھ ساکت تھے جن سے وہ لپک جھپک کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا کرتی تھی۔ انتقال کے چوتھے روز میرے بھائی نے غمگین انداز میں اپنی بیٹی اور جگر گوشہ کے لئے یہی جملے کہے تھے کہ حباء کو دوسروں کی مدد کرکے، ہر کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر دوسروں کو ٹینشن سے آزاد کردینے کی عادت تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ مجھ کو تو پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور کتنے ہی کام وہ اپنے سَر لے کر مکمل کردیتی اور کہتی ابو آپ فکر نہ کریں میں ہوں نا، بس انشاءاللہ یہ کام میرے ذمے۔

سسرال میں بھی حباء ہر دلعزیز تھی۔ اس کی ساس روتی آنکھوں اور گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھیں کہ میرے

گھر کی جھنکار جگنو اور روشنی میری حباء گھر کو ویران کر گئی۔اس نے مجھ کو اپنا اتنا عادی بنا لیا تھا میں اب اس کے بغیر کیسے رہوں گی۔وہ بتا رہی تھیں کہ ہم دونوں میں روایتی ساس بہو کی کبھی چپقلش نہ ہوتی تھی۔وہ میرے لیے اور میں اس کے لیے آرام حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔میں صبح کا کھانا پکاتی تھی اور اس کے ذمہ شام کے کھانے کی تیاری تھی مگر اس کے باوجود وہ صبح کو بھی میرے ساتھ ساتھ لگی رہتی۔میں ٹوکتی بھی تھی کہ حباء رہنے دو چھوڑ دو اس طرح تو تم میری عادتیں بگاڑ ڈالو گی۔بے انتہا خیال رکھنے والی بہو، بھابھی اور سسرال کی رونق۔دادی کی آنکھ کا تارا، ہر میکے آنے والے دن حباء کی عادت تھی کہ جب تک گھنٹہ بھر اپنی دادی کے پاس نہ بیٹھے وہ اوپر ماں کے پاس نہیں جاتی تھی۔انتقال کے بعد بدھ والے دن دادی کی آنکھیں دروازے سے لگی رہیں۔دل بہت بے قرار تھا، حباء کا آنا، اس کا بیٹھنا، مسکرا مسکرا کر بات کرنا دل کو بے قابو کیے جا رہا تھا۔بار بار آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی، میری حباء میرا منافع..... وہ سسک رہی تھیں۔حباء ان کی پہلی پوتی، نور نظر، آج ہمیشہ کے لیے ان کے دل کا قرار لوٹ لے گئی تھی۔رب کی رضا اور اس کے فیصلے پر راضی، دادی کا دل غم سے بوجھل تھا۔

کاش میں اس دن اس کو جلدی نہ جانے دیتی، اس کی ساس ہچکیوں سے روتے ہوئے بتا رہی تھیں۔صبح سے میری طبیعت اچھی نہ تھی بہت چکر آ رہے تھے اور حباء بھلا کیسے مجھ کو کچن میں خراب طبیعت پر کچھ پکانے کے لیے جانے دیتی لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی، وہ میرے بہت سر ہوئی تھی کہ میں دیر سے چلی جاؤں گی دادی نے تو ختم قرآن کی دعا نماز عصر کے بعد رکھی ہے، میں کھانے کے بعد چلی جاؤں گی مگر میں نے زبردستی بھیج دیا کہ نہیں تمھارے گھر میں تقریب ہے، اور ابھی طبیعت سنبھل بھی جائے گی تم سویرے سے جاؤ میری فکر نہ کرو، مگر مجھ کو کیا پتہ تھا۔

اور پتہ تو کسی کو بھی نہ تھا، ہونی کو بھی بھلا کوئی ٹال سکا ہے؟ اس دن بھی معمول کے مطابق سارے ہی کام ہوئے تھے۔حباء کی دادی نے اس سے پہلے بھی کتنے ہی بچوں اور بچیوں کو ناظرہ قرآن پاک کی تعلیم دی تھی اور دعا بھی کروائی تھی اور اس بار تو خود ان کی اپنی بیٹی کی ننھی سی پوتی نے کم سنی میں تکمیل قرآن کی سعادت حاصل کی تھی اور انھوں نے اپنی سب بیٹیوں، بچیوں کو گھر کی چھوٹی سی تقریب میں چائے پر بلایا تھا۔صبح سے

سارے کام ہو چکے تھے، بس نگٹس تلنے باقی تھے، امی تو خود تلنے لگیں تھیں مگر بھابھی نے ہاتھ سے لے لیے اور بھابھی سے حباء نے زبردستی لے لیے کہ مما میں تل لوں گی۔ اس کی فطرت ہی ایسی تھی ہر کام کو بڑھ کر خود کرتی تھی اور ماں نے اس کی اسی ضد سے مجبور ہو کر تلنے کو دے دیا اور بس کچھ لمحوں ہی کی تو بات تھی، تقریباً سارے ہی تلے جا چکے تھے، کڑاہی میں آخری ڈالے ہوئے تھے کہ اچانک زوردار دھماکہ ہوا اور پھر سب کچھ لمحوں میں ختم ہو گیا۔ ماں باپ کی برسوں کی پونجی، دادی کے دل کی ٹھنڈک، بہن بھائیوں کی لاڈلی، سسرال کی چہیتی حباء شعلوں کی لپیٹ میں تھی، فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا، ممکنہ حد تک ڈاکٹرز کی جماعت کھڑی کر دی لیکن رب کی رضا کہ حباء چودہ دن بعد سب کو اپنی یاد میں سسکتا چھوڑ گئی اور عمر بھر کے لیے یہ پچھتاوا بھی کہ کاش اس دن حباء سسرال سے دیر سے آ جاتی، کاش اسے نہ تلنے دیا جاتا، کاش مارٹن اسپرے جو مہینوں سے پاس ہی رکھا رہتا تھا اس دن نہ پھٹتا، ایسے کتنے ہی کاش دل میں آتے رہے اور تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہا۔

چھوٹی بہنوں کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ انکی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھنے والی آپی اب ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہے۔ کوئی ہوم ورک کا مسئلہ ہو، کہیں کپڑوں کی تیاری کا مرحلہ درپیش ہو، کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہو۔ کچھ کھانے کا دل چاہ رہا ہو، امی ابو کو دوست کے گھر بھیجنے پر منانا ہو۔ دل کی ہر بات، اسکول کی ہر بات، سہیلیوں کی عیادتیں، ہر لمحہ آپی ہی سے تو شیئر کرنا ہوتا ہے اور آج آپی چلی گئیں ہمیشہ کے لیے ہم کو تنہا کر گئیں، کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا وقت بھی آئے گا جب آپی کو پکاروں گی اور وہ جواب بھی نہ دے گی۔ ازکیٰ وعروبہ غم سے گھٹ رہی تھیں۔

ماں کو تو کسی پل چین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ہر گوشے پر حباء کی یادیں، اس کی باتیں، اس کی شرارتیں، مسکراہٹیں، کچھ بھی تو ذہن سے محو نہیں ہو رہا تھا۔ بہت سارے ملال، بہت ساری حسرتیں دل میں لیے ماں نے حوصلے سے رب کے فیصلے کو قبول کیا تھا۔ جب جب دل بے قابو ہوا، صدمے و غم نے دل کو بے انتہا جکڑا، برستی آنکھوں سے زبان پر انا اللہ وانا الیہ راجعون کا ورد جاری ہو گیا۔ مگر اس دن بہت رقت سے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ عالیہ آپی میں نے انتقال والے روز حباء کے لیے اس کی زندگی کے لیے بہت دعائیں مانگی تھیں، بہت وظیفے بھی کیے تھے۔ وہ سب کچھ پڑھا تھا جس

سے وہ صحت وزندگی کی طرف مائل ہوجاتی مگر پھر بھی اس کوموت سے نہ بچاسکی۔ہم میں سے کوئی بھی اس لمحے کوروک دینے پر قادر بھی نہیں۔

حباء کوآخری آرامگاہ لے جاتے وقت گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔یوں لگتا تھا کہ اردگرد سے سب ہی لوگ اُمڈ آئے ہیں۔ ہمارا تو کلیجہ ہی پھٹا پڑ رہا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ ان پر بھی غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔اپنے ،پرائے، ہرآنکھ اشکبار تھی، ہردل غمگین تھا۔لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر رب سے درخواست کر رہے تھے۔حباء کی میزبانی کی، اس کے بلند درجات کی، اس کی مغفرت کی، اس کے شہادت کے رتبے کی، میں اپنے دائیں بائیں سے ہونے والی دعاؤں کی بارش میں حباء کو رشک سے دیکھ رہی تھی یہ ان لوگوں کے دل کی پکار تھی جن کا حباء سے بے شک کوئی خونی رشتہ تو نہ تھا مگر محبت وپیاران کے دل میں بھی بے پایاں تھا۔

اپنے بچے کی بہترین تربیت اور اچھا مسلمان بنانے کی خواہش حباء کے دل میں بے پایاں تھی۔اس کی سمرکیمپ کی ٹیچر نے مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے کہا کہ اگرچہ میں بہت زیادہ حباء سے ملی نہ تھی مگر اس کو اپنے بچے کے لیے اس کی اچھی تربیت کے لیے ہمیشہ فکرمند پایا۔کوئی غلط لفظ تو زبان پر نہیں چڑھ گیا ہے۔ کوئی غلط عادت تو نہیں اپنالی، پڑھائی میں اور دوسری سرگرمیوں میں پیچھے نہ رہ جائے،کمسن ارسلان کی تربیت کے لیے حباء کی فکرمندی مجھے ہمیشہ متاثر کرتی تھی۔

حباء میری رفیقہ حیات، میری زندگی کی ساتھی آج مجھ سے بچھڑ گئی، اسکے شوہر کے آنسو خشک نہیں ہو رہے تھے، 6 سالہ ازدواجی زندگی میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہ تھا جب حباء مجھ سے روٹھی ہواور آج وہ ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہے۔کمرے کا ہر گوشہ یادوں کا امین ہے۔اس کو میرے آرام اور پسند کی بہت فکر رہتی تھی۔ بہت ساری باتیں وہ بن کہے ہی سمجھ لیتی تھی۔آفس جاتے وقت کپڑوں اور ناشتے کی تیاری میں ہمیشہ مسکراتے چہرے کے ساتھ مستعد رہتی تھی۔میری بیماری یا ہلکے پھلکے بخار میں فکرمند ہوکر سرہانے بیٹھ کر تیمارداری میں اپنے آرام کو بھول جاتی تھی۔حباء کی ہمیشہ کی جدائی میرے لیے بہت بڑا خلا ہے جو کبھی نہیں بھرے گا۔

زندگی کتنی مختصر ہے! جب اپنا کوئی بچھڑ جاتا ہے تو یہی محسوس ہوتا ہے اور ہم اپنے کل کی اسی حقیقت سے بےخبر دنیا کی مشغولیت میں جکڑے رہتے ہیں۔کل کیا

کھائیں گے۔ کیا پہنیں گے۔ کہاں جائیں گے۔ کیا خریدیں گے۔ اور آنے والا کل جو عمل کی دنیا سے دور لے جا کر حساب کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ کبھی سوچ بھی نہیں آتی کہ پتہ نہیں آنے والے کل میں زندہ ہوں گے بھی یا نہیں۔ اللہ ہم کو اپنے آنے والے کل کی تیاری کے لیے فکر مند و باعمل رکھے۔ آمین۔

☆☆☆

بدلتے موسم

موسمِ بہار کے دن رات طبیعت میں جو خوشگواری کا احساس پیدا کرتے ہیں وہ کسی اور موسم کے حصے میں نہیں۔ ایسی سکون بخش طمانیت صرف اور صرف بہار کی ہی عنایت ہے۔ کسی گھنے پیڑ کے نیچے کرسیاں بچھائے بیٹھے ہوں۔ دھوپ اور چھاؤں کے امتزاج کا لطف اٹھایا جارہا ہو اس کا مذکور ہی کیا۔ دھوپ کبھی تیز لگتی ہے تو کرسی چھاؤں میں کھینچ لی جاتی ہے۔ جب ہوا تیز لگتی ہے تو دھوپ مزہ دینے لگتی ہے اس کے بعد تو لان سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔

ایک وقت تھا جب ہمارے بچپن میں گھروں کے بڑے بڑے صحن ہوا کرتے تھے۔ سردیوں کی دھوپ کا لطف لینے کیلئے صحن میں چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں اور دھوپ کے ساتھ ساتھ چارپائیاں بھی صحن کے آخری کونے تک سفر کرتیں۔ جب تک دھوپ دیوار پر نہیں چڑھ جاتی تھی چارپائی کا سفر بھی دھوپ کی جانب جاری رہتا۔

قدرت کی عنایات پر غور و فکر کریں تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد یاد آجاتا ہے کہ ''کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔'' اللہ تعالیٰ کا ہم پر عظیم احسان ہے کہ اس نے ہر چیز میں ہمارے لئے انعامات اور فائدے رکھے ہیں انہیں تلاش کرنا۔ برگد، پیپل، گولہڑ، نیم، دھریک، جامن اور بیر کے درخت ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ ان درختوں سے میرا پرانا رشتہ ہے۔ جہاں کہیں ان درختوں کو دیکھتی ہوں ان سے وابستہ یادیں آنکھوں میں جگنو بھر دیتی ہیں پیپل اور دھریک کی ٹھنڈی چھاؤں اور منہ میں جامن اور بیروں کی مٹھاس محسوس ہونے لگتی ہے۔

مگر اب صرف پھولوں سے رشتہ باقی ہے۔ تمام لان رنگ برنگے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ پھول ہماری عملی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں سبھی جانتے ہیں۔ موسم بہار میں تو پھول ایک نیا جوبن دکھلاتے ہیں۔ گھروں کی سجاوٹ، دفتروں کی آرائش اور مریضوں کی صحت یابی پر پھول خوشگوار اثر ڈالتے ہیں۔ یہ زندگی میں نئی توانائی بھر دیتے ہیں۔ رنگ برنگے دلکش پھولوں کو دیکھ کر لبوں پر خود بخود مسکراہٹ مچلنے لگتی

ہے۔مریضوں کو یہ ''get well soon'' کا پیغام دیتے ہیں۔نرم ونازک پھول اپنے اندر بڑی طاقت رکھتے ہیں جو انسانوں کو جینے کی امنگ، حوصلہ اور امید دیتے ہیں۔ اسی لیے پھولوں کو بہترین معالج بھی کہا جاتا ہے۔ان کے اندر بیماریوں کو دور بھگانے کی قوت بھی ہوتی ہے۔

بہت سے پھول ادویات میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ Hebisus دل کی بیماری اورPienict کینسر کے مرض میں فائدہ مند ہے۔

میری گولڈ تو صدیوں سے یونانی، ہندوستانی، مصری اور رومن ادویات میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ سردرد، دانت درد، سوجن اور دل کی بیماری میں مفید ہے۔

ڈیفوڈل ''Daffodill''جس کے بارے میں انگریز شاعر ورڈزورتھ کی لازوال نظم جو ہر دور میں ہمارے نصاب میں شامل رہی ہے اس کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ یہ پھول نہ صرف اپنی خوبصورتی سے قدرتی ماحول کو دلکش بناتا ہے بلکہ دماغ کے کینسر کیلئے بھی مفید ہے۔

عرقِ گلاب کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہ عرق چہرے کی خوبصورتی کو بڑھانے، جھریوں کو دور کرنے، آنکھ کی سوزش، دل کی مضبوطی اور کھانوں کی لذت دوبالا کرنے میں کام آتا ہے۔

بات موسم کی ہورہی تھی بہت دور تک جانکلی۔اب اس موسم کے پھل کینو مالٹے، سنگتروں کی بات ہوجائے۔ترش پھلوں کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہیں پھلوں کی کھٹی میٹھی خوشبو کے ساتھ ساتھ انواع واقسام کے پھولوں کی مسحورکن خوشبو چہارسو پھیلی ہوئی ہے۔آج کل تمام درخت اور پودے اپنے پرانے پہناوے اتار کر نئے پتوں کے ساتھ طلوع ہورہے ہیں۔پیپل، جامن، انجیر،آم سبھی نے نئے لباس پہن لئے ہیں۔ کچنار کے درخت سفید اور پیازی ڈوڈیوں سے لدے ہیں۔

سفید گلاب کی لڑیاں جھومر کی طرح دیواروں پر لٹکی جھوم رہی ہیں۔ ان کے بعد بوگن ویلا کی بیلیں دیواروں کو نیا رنگ وروپ دینے کی تیاری میں ہیں۔

ہمارے گھر کے باہر لگے کیکر کے درخت نے نئی اوڑھنی اوڑھ لی ہے اس درخت کے بہت سے قصے پرانی کہانیوں میں ملتے ہیں۔ جادوئی داستانوں میں اس کا تذکرہ خصوصاًملتاہے۔ اے حمید کی بارش، سماوار اور خوشبو میں اس کا بہت ذکر ہے۔ اس کی

پراسراریت اپنی جگہ پر مگر یہ فائدہ مند بھی ہے۔ برصغیر میں صدیوں پہلے اس کی چھال سے مختلف مشروب بنائے جاتے تھے۔ بہت سے دیہاتوں میں آج بھی اس کے گودے سے قہوہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب برصغیر میں چائے ابھی متعارف نہیں ہوئی تھی۔ کیکر کی لکڑی چھوٹے موٹے فرنیچر میں استعمال ہوتی ہے۔ مضبوط فرنیچر کے لئے شیشم زیادہ مقبول ہے۔ کیکر کی کچی پھلیوں کو گوشت اور قیمے میں پکایا جاتا ہے۔ اس کے کھانے سے ریشہ ختم ہوجاتا ہے اور جوڑوں کے درد میں بھی مفید ہے۔ اس کی ٹہنیوں سے مسواک بہت اچھی بنتی ہے۔ یہ پرندوں کی محفوظ پناہ گاہ بھی ہے اکثر پرندے کیکر کے درخت میں گھونسلہ بناتے ہیں کیونکہ اس کے کانٹوں کی وجہ سے بڑے پرندے ادھر کا رخ نہیں کرتے۔

ہمارے پرانے گھر میں گولہڑ کا درخت تھا جس کے کچے پھول کو قیمہ میں پکایا کرتے تھے اور پکے پھل کی شکل انجیر یا سٹرابری سے ملتی جلتی تھی۔ جسے لوگ جھولیاں بھر بھر کے کھانے کے لئے لے جاتے اور اس سے مختلف دوائیاں بناتے۔

بوڑھے درختوں کے نیچے بیٹھے ہوں تو اکثر ٹھنڈک کے فرحت بخش احساس کے ساتھ ساتھ ان کے پتے ماضی کی بہت سے کہانیاں سناتے محسوس ہوتے ہیں مگر ماضی ہمیشہ آج کے دور سے بہتر محسوس ہوتا ہے۔

آج ہم جشنِ بہاراں کیسے منا سکتے ہیں جبکہ ہمارے پورے ملک میں سوگ کا سماں ہے جہاں ایک طرف کوئٹہ کی ٹھنڈی برف وادیوں میں دہشت گردی کے شکار ہمارے بہن بھائی انصاف کی امید میں اپنے پیاروں کی لاشیں سڑکوں پر رکھنے پر مجبور ہوں دوسری جانب کراچی کی خون آلود صبحیں اور شامیں ٹارگٹ کلنگ کی زد میں ہوں جبکہ ہمارا وزیرستان ڈرون حملوں سے برباد کیا جارہا ہو اور حال ہی میں ہمارے لاہور میں عیسائیوں کی بستیوں کو جلا دیا جائے تو کیسی بہار؟

مجھ سے یہ پھول پوچھ رہے ہیں اس بار ہمارے مصرف کیا ہیں؟

کیا اس بار پھولوں کی قسمت میں صرف تربتوں میں سجنا ہی رہ گیا ہے؟

☆☆☆

صائمہ اسما

تبصرہ کتب

امریکی دہشت گردی، تاریخ اور اثرات'' یہ میر بابر مشتاق کی تازہ تصنیف ہے جس میں آج کے دور کی اس سب سے بڑی مصیبت یعنی دہشت گردی کے خلاف جنگ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

دہشت گردی کی کسی متفقہ اور واضح تعریف کی عدم موجودگی سے لے کر خود امریکی تعریف کے مطابق امریکہ کے طرزِ عمل پر دہشت گردی کا اطلاق، اس پر کتاب میں بہت سا مستند مواد موجود ہے۔ بہت سے امریکی اور یورپی ناقدین کی تحریروں کے اقتباسات اور بیانات اس موضوع پر شامل کیے گئے ہیں۔ امریکہ کی یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ خود کس کس پہلو سے خالص دہشت گردی کے ضمن میں آتی ہے، اس کا تفصیلی تذکرہ ہے اور دنیا میں دہشت، تشدد، بدامنی، ناانصافی اور اسلحہ کو رواج دینے والے مغربی ملکوں کے جرائم کا احاطہ کیا گیا ہے۔ امریکہ کے کھلم کھلا دہرے معیارات اور حد سے بڑھے ہوئے ظلم کی بنا پر امریکی سپر طاقت کے بتدریج خاتمے کی پیشین گوئی پر مبنی ابواب اس میں شامل ہیں۔ نیز مغربی دنیا کے مختلف دانشوروں، سابق حکومتی اہلکاروں اور ایجنسیوں کے لوگوں کے اعترافات بھی درج کیے گئے ہیں۔ امریکی فوج میں بڑھتے ہوئے ذہنی امراض پر بھی ایک باب موجود ہے۔

کتاب عثمان پبلی کیشنز کراچی سے شائع کی گئی ہے، 280 صفحات اور 330 روپے قیمت میں اچھی پیش کش ہے۔ ہمارے ملک میں بھی چند حلقے امریکہ کی اس نحوست بھری جنگ اور پاکستان کی اس میں شمولیت کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

☆☆☆

مزیدار کھانے

چکن جنجر:

مرغی کا گوشت گول بوٹی ایک پاؤ، تین ٹماٹر کٹے ہوئے، چار جوئے لہسن پسے ہوئے، آئل 1/2 کپ، سبز مرچ پانچ عدد، ادرک ایک ٹکڑا، سرخ مرچ نصف چمچ، نمک حسبِ ذائقہ، کیچپ ایک چمچ، دہی تین چمچ، ہلدی نصف چمچ، آدھا کپ سبز دھنیا۔

ترکیب: گوشت کو باریک کاٹ لیں۔ گوشت، لہسن اور ٹماٹر ایک فرائنگ پین میں ڈال کر بغیر پانی ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب پانی خشک ہوجائے تو آئل اور نمک مرچ ڈال دیں۔ پانچ منٹ بعد دہی ڈال کر بھونیں۔ اب دو سبز مرچ گول کاٹ کر ڈال دیں۔ ایک سبز مرچ لمبائی کے رخ اور ادرک بھی لمبائی کے رخ کاٹ کر ڈالیں۔ آدھا کپ سبز دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں اور آخر میں کیچپ ڈال کر دم دے دیں۔ آدھا چمچ گرم مصالحہ پسا ہوا آگ بند کرنے کے بعد چھڑک دیں۔

آلو مونگرے:

مونگرے ایک پاؤ، آلو ایک پاؤ، ایک بڑا پیاز، نمک ایک چمچ، سرخ مرچ ایک چمچ، ہلدی نصف چمچ، کلونجی نصف چمچ، لہسن ایک چمچ، ادرک ایک چمچ، سفید زیرہ ایک چمچ، سوکھا دھنیا ایک چمچ،

ترکیب: مونگرے چھوٹے چھوٹے کاٹ لیں۔ آئل میں پیاز ٹماٹر اور مونگرے ڈال کر اچھی طرح بھون لیں اور نمک مرچ، لہسن، دہی ڈال کر دس منٹ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب مونگرے گل جائیں تو آلو ڈال دیں۔ کلونجی، سوکھا دھنیا اور سفید زیرہ پیس کر ڈال دیں۔ دس منٹ پکائیں۔ اور آلو گلنے پر سبز دھنیا ڈال کر اتار لیں (آلو اور مونگرے اکٹھے ڈال دیں تو مونگرے سخت رہ جاتے ہیں)

☆☆☆

محشرِ خیال

شمیم فاطمہ-کراچی

کبھی پوسٹ آفس بند، کبھی شاہراہیں بند، کبھی شہر بند، کبھی ناک بند، کبھی گلا بند.....ان بندشوں میں جانِ آفریں ایسی نظر بند ہے کہ ..... جی جانتا ہے ! کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں ہے، عقل و ہوش، دل و دماغ .....آج کا کام کل پر اور کل کا پرسوں پر ٹل جاتا ہے .....(اور ڈر لگنے لگتا ہے کہ ٹلتے ٹلتے اس اٹل فیصلے کا دن نہ آجائے!) آج کی بات کل پرانی ہو جاتی ہے اور کل کی بات آج آؤٹ آف فیشن اور آؤٹ آف ڈسکشن ہو جاتی ہے۔ لکھے ہوئے مضمون لفافہ پوسٹ کیے جانے کے انتظار میں پڑے پڑے ردی اخبار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں اب کیا فائدہ، اب تو وقت نکل گیا۔

ہمارے علاقے میں جو ڈاکخانہ ہے اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ جس طرح ایک بس ڈرائیور اس وقت تک بس نہیں چلاتا جب تک اس کی بس میں گنجائش سے زائد سواریاں نہ سوار ہو جائیں، اسی طرح ڈاکخانے کا عملہ انتظار کرتا ہے ایک ایسے لمحے کا، ایک ایسی ساعت کا جس میں چالیس لاکھ عوام کے خطوط جمع ہو جائیں تو وہ انھیں مرکزی پوسٹ آفس جمع کرائے .....اس سے آگے جونجی پوسٹ آفس عوام کی سہولت کے پیشِ نظر کھلا ہے وہ اب شام کے اوقات میں کھلتا ہے، کبھی وہ بھی بند رہتا ہے، صاحب کا کہنا ہے کہ ہم بھی یہاں سے نو دو گیارہ ہو رہے ہیں، ڈاکخانے کا چل چلاؤ ہے ..... سو اتنا آساں بھی نہیں تجھ کو لفافے بھیجنا! بس تحریر کی راہ میں یہ روڑے بھی اٹکے ہوئے ہیں۔ ہاں کچھ نظمیں آپ کو SMS کے ذریعے ..... ہوسکتا ہے انھیں دیکھ کر آپ سوچتی ہوں کہ.....لو! پھر ایک آ گئی۔ بس جی چاہتا ہے کہ کوئی سخن فہم سن لے .....سو تحفتاً بھیج دیتے ہیں .....شاید انھیں پڑھ کر آپ ایک لمحے کے لیے اس جہانِ غم سے دور ہو جائیں .....بس وہ ایک لمحہ میری طرف سے آپ کے لیے! (شائع کرنے نہ کرنے کی ٹینشن میں مبتلا نہ ہوئیے گا، موقع ، حالات، قلت

(کمیابی) کے حساب سے لگایئے نہ لگایئے، جانِ جہاں! اختیار ہے)۔

اس ساری بے ترتیبی، سراسیمگی کی نذر ''گل دوپہر'' کی گرمجوشی بھی ہوگئی..... وہ نہ لکھ سکے جو لکھنا تھا..... وہ نہ کہہ سکے جو کہنا تھا..... کبھی کبھی ادھوری بات، ایک ''ان کہی'' کہنے سننے کے تعلق کو قائم رکھتی ہے، انسان ''چلو پھر سہی!'' کہہ کر پھر کوئی بات سمیٹنا، جمع کرنا شروع کر دیتا ہے کسی سے کچھ کہنے کے لیے .....سو یار زندہ صحبت باقی!

شاہدہ اکرام صاحبہ کی محبت کا ادھار بھی لیے بیٹھے ہیں ..... کس محبت سے انھوں نے میرا انشائیہ پڑھا اور سراہا۔ آپ کو کیا راز بتاؤں؟ مجھے تو قلم اٹھاتے ہوئے بالکل پتہ نہیں ہوتا کہ جب یہ اڑان بھرے گا تو کہاں لے جائے گا۔ کسی میدانی علاقے میں اتارے گا یا پہاڑی علاقے میں، سمندر میں ڈبوئے گا یا خشکی پہ اتارے گا بس اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ زمین پر بحفاظت لینڈ کروا دے ..... اللہ کے کرم اور آپ لوگوں کی دعاؤں سے اس گلشن میں ہم نے بھی ایک دکان لے لی ہے (بغیر کرائے اور بغیر بھتے کے) اللہ کی مدد شامل حال رہنے کی دعا ہے۔ (ہمیں جو میسر ہے اس کی عطا ہے!) فرزانہ جی کا شکریہ کہ انھوں نے خطوطِ وحدانی کی جانب توجہ دلائی۔ قانتہ رابعہ کو سلام اور دعائیں..... ''سفر سعادت'' بہت خوب لکھا، گھر بیٹھے وہاں حاضر ہو گئے! اللہ مزید لکھواتا رہے..... سعادت کا سفر جاری رکھے۔

فروری کا ''بتول'' قاضی صاحب کے نام کر کے آپ نے انھیں جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے، پرچہ بڑی محنت، لگن، توجہ سے ترتیب دیا ہے۔ نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز! جب تک یہ تین عناصر ایک جگہ جمع نہ ہوں کوئی انسان ''رہنما'' کے منصب پر فائز نہیں ہوسکتا..... ہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں تو ہمارے درمیان مخالفت قائم ہو جاتی ہے ..... ہم ان رنگ برنگے پھولوں کو نہیں دیکھتے جو آپس میں اختلاف رکھنے کے باوجود آپس میں دست و گریبان نہیں ہوتے، گلشن کے کاروبار میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ اتحاد و یگانگت کی فضا قائم رکھتے ہیں، گلشن کے اتحادی گلشن کے وفادار ہی رہتے ہیں اپوزیشن میں نہیں جا بیٹھتے ناراض ہو کر..... ''چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے

کے چلو‘ ایسے لوگ جب جاتے ہیں تو سب کو سوگوار کر
جاتے ہیں اور زمانہ انھیں مدتوں یاد رکھتا ہے۔

بتول کی تمام قلم کاروں کو سلام اور نیک
خواہشوں کا سلام! اس دعا کے ساتھ کہ

پاکستان کے سارے شہر وزندہ رہو پائندہ رہو
روشنیوں رنگوں کی لہر و زندہ رہو پائندہ رہو

☆☆☆

میکاولی کی سیاسیات اور پاکستانی سیاست

میکاولی اٹلی کا مشہور مفکر تھا جس نے سولہویں صدی عیسوی میں سیاست کے نئے اصول پیش کیے۔ وہ اٹلی کے شہر فلورنس کا باشندہ تھا اور اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا، اپنی تیرہ سالہ ملازمت کے دوران و ہ اٹلی کی سیاسی کمزوریوں اور ہمسایہ ملکوں سے اس کی کشاکشی پر غور کرتا رہا۔ وہ پکا قوم پرست تھا اور اٹلی کو سیاسی اور عسکری لحاظ سے فرانس اور اسپین پر غلبہ دلانے کے لیے سوچ بچار کرتا رہتا تھا۔ اس غور وفکر کے نتیجے میں اس نے سیاسی قوت حاصل کرنے، اسے منظّم کرنے اور توسیع دینے پر ''The Prince'' نامی مشہورِ زمانہ کتاب لکھی جس میں بادشاہوں کے لیے دھوکا بازی اور مکروفریب پر مبنی لائحۂ عمل پیش کیا گیا اور بادشاہ کی ذات کو ہر باز پرس سے بالاتر قرار دیا گیا۔ اس طرح بادشاہوں کا قول ہی خیر وشر کا معیار بن گیا۔

میکاولی کی تعلیمات کا خلاصہ یہ تھا کہ عام افراد کو تو اخلاقیات کا پابند ہونا چاہیے، لیکن بادشاہ اخلاقی اصولوں سے بالکل آزاد ہے۔ جو چاہے کرسکتا ہے، جو چیز بھی اسے مفید معلوم ہو وہ اچھی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''ہر شخص جانتا ہے کہ بادشاہ کے لیے یہ بات قابل تعریف ہے کہ وہ عقیدہ وایمان رکھے اور دیانت و امانت کے ساتھ زندگی گزارے، چالاکی کے ساتھ نہیں۔ تاہم ہمارے زمانے کا تجربہ یہ ہے کہ زیادہ کام وہ بادشاہ کر گئے جنھوں نے اچھے عقیدہ کا لحاظ نہیں کیا اور چالاکی کے بل بوتے پر لوگوں کے دماغوں کو حیران رکھا اور آخر کار ان لوگوں پر غالب آ گئے جو وفاداری کو بنیادی اصول بنائے ہوئے تھے۔ بادشاہ کو بیک وقت لومڑی اور شیر بننا چاہیے۔ جنھوں نے لومڑی کی نقل کی وہ اکثر کامیاب ہوئے۔ لیکن ریاکاری اور دروغ گوئی کے اس کردار کو چھپانا ضروری ہے۔ عام لوگ اتنے سادہ ہیں اور حالات کے تقاضوں پر عمل کے لیے اس قدر آمادہ رہتے ہیں کہ ہر فریبی کو فریب کھانے والے مل جاتے ہیں۔ بادشاہ کو اس بات کا بڑا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے منہ سے رحم، وفا، انسانیت، خلوص اور مذہبی عقائد کے خلاف کوئی بات نہ نکلے۔ لوگ عموماً

ہاتھوں سے نہیں، آنکھوں سے اندازے لگاتے ہیں۔ ہر شخص دیکھتا ہے آپ کیسے نظر آتے ہیں۔ محسوس بہت کم کرتے ہیں کہ آپ دراصل کیا ہیں۔''

میکاولی کی سیاست نے یورپ میں نئی اخلاقی اقدار کو متعارف کرایا۔ پھر جب استعماری طاقتیں اپنی تہذیب و تمدن اور تعلیمی نظام کے ساتھ عالم اسلام پر حاوی ہوئیں تو یہی افکار اسلامی معاشرے کے سیاسی طبقے میں بھی سرایت کرتے چلے گئے۔ آج ہم اپنے لیڈروں، سیاست دانوں اور حکام کو بے دریغ جھوٹ بولتے، وعدہ خلافیاں کرتے، وفاداریاں تبدیل کرتے اور اداکاری میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیتے دیکھتے ہیں تو اس کی تہہ میں یہی اخلاقیات کام کر رہی ہیں۔ اس قسم کی دھوکا دہی کو فی زمانہ وہی اصولی حیثیت حاصل ہو چکی ہے جو کسی دور میں سچائی، امانت، دیانت اور وفاداری کو نصیب تھی۔ موجودہ سیاست میں یہ الفاظ صرف الفاظ ہی رہ گئے ہیں۔ ان کی حقیقت سے کم از کم ہمارا معاشرہ خالی نظر آتا ہے۔

میکاولی کا نظریہ یورپی سیاست کے مزاج کو بنانے میں اہم کردار ضرور ادا کرتا رہا ہے مگر اس نظریے کے پیچھے ایک بنیادی سوچ یہ بھی تھی کہ بادشاہ یا حاکم کو یہ تمام دھوکا بازی، بناوٹ اور دوغلا پن اپنے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے اختیار کرنی چاہیے۔ جیسا کہ میکاولی کے افکار میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے۔ لیکن یہ یورپی فلسفہ جب ہمارے مسٹروں نے سیکھا تو اس سے حب الوطنی اور قومی فلاح و بہبود کے تصورات کو بھی اڑا دیا اور صرف اپنی ذات، اپنی کرسی، اپنی اغراض اور اپنے خاندان کے مفادات ہی کو قبلہ و کعبہ اور مقصودِ اعظم قرار دے دیا۔ چنانچہ آپ گزشتہ تیس چالیس سالوں کے تمام نامور سیاست دانوں کو دیکھ لیجیے۔ سیاست کی تاریخ پڑھ ڈالیے۔ حکومتوں کے بننے گرنے اور محلاتی سازشوں کے تانوں بانوں پر غور کر کے دیکھیے، ہر جگہ آپ کو مفادات کی پوجا ہوتی نظر آئے گی، صرف اور صرف ذاتی مفادات کی۔ قوم کے مسائل کیا ہیں، لوگوں کا کیا حشر ہو رہا ہے، ملک کس دلدل میں پھنسا ہوا ہے، خارجہ پالیسی کتنی غیر متوازن ہے، توانائی کے سوتے کس قدر خشک ہو رہے ہیں، ٹرانسپورٹ کا نظام کتنا تباہ ہو رہا ہے، بڑے بڑے ادارے کیوں خسارے میں جا رہے ہیں، عدل و انصاف کیوں عنقا ہے،

بدامنی اور خانہ جنگی کا ماحول کیوں کر بن رہا ہے، ان سوالات سے حکام کو غرض ہے نہ اپوزیشن کو۔ ان کا کام تو صرف اپنے غیر ملکی اکاؤنٹس میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنا ہے تاکہ جب ملک کی ہڈیوں میں گودا تک نہ بچے تو یہ اپنی عمر عزیز کا باقی حصہ اس لوٹی ہوئی دولت سے عیاشی کرنے میں گزاریں۔

ہم میکاولی کے فلسفے کو شرمناک سمجھتے ہیں اور خود متعدد مغربی مفکرین نے اس پر شدید تنقید کی ہے اور اسے انسانی معاشرے کے لیے اخلاق کش قرار دیا ہے لیکن میکاولی کے افکار سے کہیں گھٹیا تصورات جو ہمارے یہاں رائج ہو چکے ہیں ان کی مثال تو شاید دنیا کی کسی قوم میں نہ ملے۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی سیاست دان بھی اپنی اقوام سے دھوکا کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور سہانے سپنے دکھاتے ہیں مگر وہاں قوم کو محاسبے کا بہرحال اتنا اختیار ہے کہ حکمرانوں کی چرب زبانی قوم کو کسی بحران میں مبتلا نہیں کرتی۔ مگر ہمارے ہاں تو بے حسی کا عالم طاری ہے۔ لوگ مہنگائی سے عاجز آ کر بھوکے مرتے ہیں تو حکمران کہتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، ہر دور میں مہنگائی رہی ہے۔ اگر کسی کو روٹی نہ ملے تو ڈبل روٹی کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ بجلی نہ ہو تو بل کم آنے کا اطمینان دلایا جاتا ہے۔ جس ہفتے کراچی میں صرف چالیس پچاس بندے مریں تو حکومت فخر سے کہتی ہے کہ حالات قابو میں ہیں، ٹارگٹ کلنگ کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے حکمرانوں سے کسی شریفانہ و مخلصانہ سلوک اور کسی خیر کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ میکاولی کے فلسفے سے استفادہ کر کے یورپی ملکوں نے استعماری طاقتوں کی شکل اختیار کر کے غیر ممالک کو لوٹنا سیکھا تھا مگر ہمارے سیاست دان اور ہمارے حکام اپنے ہی گھروں میں دن دہاڑے ڈاکے مارتے ہیں اور بڑی معصوم سی شکل بنا کر خود ہی پوچھتے ہیں کہ کون ہے جو ملک کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

اگر ہمیں ملک بچانا ہے تو اب کسی تاخیر کے بغیر صالح قیادت کو ملک سونپنا ہوگا۔ صالح قیادت کس طرح لائی جائے۔ اس کے لیے ہمارے اربابِ علم و دانش کو کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا ہوگا۔ اس میں انتظار یا سستی کی گنجائش نہیں کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

(روزنامہ اسلام)

☆☆☆